انتقام
ایم اے راحت

الزام

دسمبر کی کہریلی صبح تھی۔ مرینہ نے رضائی سے منہ نکالا تو لگا جیسے کسی نے برف کا برادہ چہرے پر پھینک مارا ہو۔ اس نے جلدی سے رضائی دوبارہ چہرے پر ڈھک لی لیکن منہ چھپانے سے بلی نہیں بھاگ جاتی آج کی رات تو ویسے ہی سوتے جاگتے گزری تھی۔ انٹرویو لیٹر میں صبح نو بجے کا وقت ہی لکھا ہوا تھا اور خاص طور سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا براہِ کرم وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔ یہ جملہ ذہن میں گونجا تو اس نے جلدی سے دوبارہ چہرہ کھول لیا۔ سردی جیسے تاک میں تھی لیکن اس بار اس نے اسے اہمیت نہیں دی اور خرگوش کی طرح کان کھڑے کر کے باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ سڑک پر جھاڑو لگنے کی سرسر تو نہیں شروع ہوئی۔ دودھ والوں کی سائیکلوں کی گھنٹیاں تو نہیں بج رہیں پھر کہیں سے کتوں کو بھونکنے کی آوازیں اُبھریں تو دل کو سکون ہو گیا ابھی کچھ رات باقی ہے۔ اب کیا کروں دل تو کہہ رہا تھا کہ رضائی چہرے پر لے کر آنکھیں بند کر لی جائیں لیکن اگر نیند گہری آ گئی تو...... بے اختیار اس کی نگاہیں دیوار کی جانب اُٹھیں اور مایوس ہو کر واپس آ گئیں۔ اب اس دیوار پر گھڑی کہاں تھی، وہ تو بک گئی تھی کاش وہ گھڑی ہوتی تو وقت کا پتہ چل جاتا پتہ نہیں کیا بجا ہے کیسے معلوم ہو۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' آواز گونجی اور وہ اُچھل پڑی۔ سردی شیطان کی طرح

فرار ہوگئی اوراس نے خوشی سے پوری رضائی اُتار کر پھینک دی۔ اس کے دل میں نور پھیل گیا۔ کیسے صحیح وقت میں اللہ کا نام سنائی دیا ہے۔ کس قدر دلنشیں ہے یہ آواز۔ کس قدر دلنواز ہے یہ پکار۔ ایک انوکھا سہارا ملا اور وہ پلنگ سے اُتر آئی۔ پھر اس کی نظریں برابر والی پلنگ کی جانب اُٹھ گئیں۔ ماں جی سو رہی تھیں۔ دل چاہا کہ ماں جی کا ماتھا چھو کر دیکھے پتہ نہیں اس وقت بخار کتنا ہے۔ کئی دنوں سے تیز بخار ہو رہا تھا انہیں لیکن اس وقت یہ کوشش ٹھیک نہیں تھی، اس کے ہاتھ پاؤں یخ ہو رہے تھے۔ ٹھنڈا ہاتھ ماں جی کے ماتھے پر لگا تو ان کی آنکھ کھل جائے گی اور پھر رات کو تو کھانسی بھی زیادہ ہی اُٹھی تھی۔ اس وقت البتہ وہ پُرسکون تھیں۔ اللہ مالک ہے۔ وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھی اور بے آواز چٹخنی کھول کر باہر نکل آئی۔ لاہور دسمبر کی دُھند اوڑھے ہوئے تھا۔ ہوا برف کی سلوں سے گزر کر آ رہی تھی لیکن وہ بھی تو تھے جو اللہ کی طرف بلا رہے تھے۔ 'الصلوۃ خیر من النوم' وہ صحن میں آ گئی۔ وضو کیا۔ جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ ہر کام ہولے ہولے کر رہی تھی کہ آواز نہ ہونے پائے۔ ماں جی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ مصلّے پر بیٹھ کر نماز میں گم ہوگئی اور پھر اس وقت تک وہیں بیٹھی پڑھتی رہی جب تک مشرق میں اندھیرے کا طلسم نہ ٹوٹ گیا۔ اس نے دعا مانگی۔

''مالک دو جہاں تیرے فرشتے صبح کو رزق بانٹنے نکلتے ہیں۔ ماں جی اور دوسرے بزرگ یہی کہتے ہیں مجھے بھی رزق عطاء کر، مجھے نوکری مل جائے، میرا انٹرویو کامیاب ہو جائے۔'' کہیں دُور سے دودھ والے کی سائیکل کی گھنٹی کی آواز اُبھری تو وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ والا آ کر دروازہ بجا دے۔ دروازہ بجے گا تو ماں جی کی آنکھ کھل جائے گی۔ اس نے فوراً باورچی خانے سے رات کو دھو کر رکھا ہوا دودھ کا برتن اُٹھایا اور اسے لے کر پھرتی سے دروازے پر آ گئی اور دروازہ کھول کر دودھ والے کا انتظار کرنے لگی۔ اگر دودھ والا دروازہ بجا دے گا تو ماں جی کی آنکھ کھل جائے گی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد دودھ والا اس کے دروازے پر پہنچ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

''سلام علیکم ماموں مراد علی۔''

''وعلیکم السلام بیٹا! تم نے چادر نہیں کی۔ کہیں ٹھنڈ لگ جائے گی بُری بات ہے بیٹا خیال رکھا کرو۔''

''جی ماموں جی۔'' اس نے دودھ لیا اور دروازہ بند کر کے اندر آ گئی پھر چائے کی دیگچی چولہے پر رکھ دی اور چولہا جلا کر چائے بنانے لگی۔ اس کے کان اندر کی آوازیں بھی سن رہے تھے کہیں ماں جی آواز نہ دے لیں۔ چائے کا پانی کھولنے لگا۔ اس نے پتی وغیرہ ڈالی اور پھر ایک پیالی چائے اپنے لئے بنالی۔ گرم گرم چائے کے گھونٹ لیتی ہوئی وہ کمرے کی طرف احتیاط سے بڑھی اور احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ پچھلی کھڑکی سے روشنی اندر آ گئی تھی اور اس روشنی میں اسے ماں جی جاگتی ہوئی نظر آئیں۔ ان کا چہرہ لحاف سے باہر تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چونک پڑی اور پھر آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

''کیسی طبیعت ہے ماں جی! آپ تو جاگ رہی ہیں۔ میں تو ہر کام ہولے ہولے کر رہی تھی کہ کہیں آپ کی آنکھ نہ کھل جائے۔'' اس نے چائے کی پیالی جلدی سے ایک تپائی پر رکھی اور ماں جی کے قریب پہنچ کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ماں جی کا بخار اس وقت بہت ہلکا تھا، چہرہ بھی پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہی کچھ اوڑھے بغیر باہر نکل جاتی ہو کم از کم شال تو لے لی ہوتی، سوئیٹر پہن لو۔''

وہ ایک دم مسکرا دی۔ ''سردی تو لگ ہی نہیں رہی ماں جی۔ بس سردی اس وقت لگتی ہے جب تک اسے مناتے رہو۔''

ماں جی نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ چمپئی بدن کی چمکتی ہوئی کھال کے نیچے بچھے ہوئے رگوں کے جال میں سیماب دوڑ رہا تھا۔ بھلا اس سیماب کے سامنے سردی کی کیا حیثیت ہوتی۔ انہیں شاید اپنی جوانی یاد نہیں رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر مسکرا دی۔

''طبیعت کیسی ہے ماں جی آپ کی؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ بس سینے پہ اس جگہ ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔'' ماں جی نے ایک ہاتھ رضائی سے نکال کر سینے پر رکھا۔

''چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔ ابھی اُٹھیں نہیں۔ منہ وغیرہ بعد میں دھولیں میں صفائی کے لئے پانی لاتی ہوں۔''

ماں جی نے اس کی بات مان لی تھی۔ وہ اپنی چائے کی پیالی وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔ باورچی خانے میں آ کر تھوڑا سا گرم پانی لیا۔ چائے کی ایک اور پیالی بنائی اور پھر دونوں چیزیں لئے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ برابر میں رکھی ہوئی پلاسٹک کی بالٹی ماں جی کے پلنگ کے پاس رکھی اور پانی کا گلاس ان کی جانب بڑھاتی ہوئی بولی۔

''چلیں کلی کر لیں۔''

ماں جی نے کلی کی اور اس نے چائے کی پیالی ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ تھوڑی سی اُٹھ گئی تھیں۔ چائے کی پیالی سے گرم آبِ حیات کے چند گھونٹ لے کر انہوں نے کہا۔

''کس وقت جاؤ گی؟''

''بس ماں جی ساڑھے سات بجے نکل جاؤں گی۔ نئی جگہ ہے دفتر بھی تلاش کرنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے اس میں کچھ وقت ہو۔''

''تمہاری چائے ٹھنڈی ہوگئی ہوگی، کچھ کھالو چائے کے ساتھ، پتہ نہیں کب تک واپسی ہو۔''

''آپ میرے بارے میں اتنی فکرمند نہ ہوا کریں اب میں بچی نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے چائے کی پیالی اُٹھائی اور اس کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگی۔ چائے ختم کر کے اس نے پیالی رکھی اور بولی۔

''آپ کے لئے کچھ لے کر آؤں؟''

''نہیں بس یہ چائے کافی ہے۔''

وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر الماری کے پاس پہنچ گئی۔ الماری کھول کر اس نے

اپنے لئے لباس نکالا جو رات ہی کو تیار کر کے الماری میں لٹکا دیا تھا اور اس کے بعد کمرے سے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے لباس تبدیل کیا۔ امی کو تسلی کے لئے سوئیٹر بھی پہن لیا اور اس کے بعد ان کے پاس پہنچ گئی۔ امی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بدستور نیم دراز تھیں۔ چائے کی آدھی پیالی پی تھی انہوں نے اور باقی آدھی پیالی برابر بستر پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ ان کے قریب پہنچ گئی۔

''کیا ہوا کیا بات ہے۔ ابھی تو آپ ٹھیک تھیں اب کیا ہوگیا؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے درد ذرا بڑھ گیا ہے۔'' ماں جی نے مدھم لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پھیل گئے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی غیرموجودگی میں ماں جی کا درد بڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ ماں جی نے فوراً اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا وہ جلدی سے سنبھل گئیں اور انہوں نے کہا۔

''تم پریشان ہوگئی نا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد بچیاں پڑھنے آ جائیں گی۔ دُھوپ نکل آئے گی تو میں دُھوپ پر جا بیٹھوں گی۔

''اور اگر درد بڑھ گیا تو......''

''کہا نا نہیں بڑھے گا پسینے میں ہوا لگ گئی ہے۔ دُھوپ میں بیٹھوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماں جی نے اپنے لہجے کو نارمل بنا کر کہا اور اسے کسی قدر اطمینان سا ہو گیا۔ گویا تشویش کی واقعی کوئی بات نہیں ہے۔ بہرحال اس کے بعد اس نے دوسری تیاریاں کیں اور پھر آہستہ سے بولی۔

''کاش گھڑی ہوتی۔ اب تو وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے مجھے نکل جانا چاہیے سوا سات یا ساڑھے سات بج ہی گئے ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا ماں جی؟''

''اپنی تمام چیزیں لے لیں؟''

''ہاں...... لے لیں۔'' اس نے کہا۔

''جاؤ اللہ تمہیں کامیابی عطا کرے۔'' ماں جی کے لہجے میں ایک عجیب سا احساس تھا۔ وہ باہر نکل آئی اور پھر ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کے دل

سے دعائیں نکلنے لگیں۔

"یا اللہ! آج میری مشکل حل کر دے۔ نوکری اس وقت میری اور ماں جی کی زندگی اور اس گھر کی عزت کی ضمانت ہے۔"

اور بات بالکل ٹھیک تھی، نجانے کس کس طرح کی گاڑی دھکیل کر یہاں تک لائی گئی تھی اور اب اس سے آگے صرف خلاء تھی۔ یہ سوا دو مرلے کا گھر بھی ماں جی نے نجانے کس کس طرح خریدا تھا۔ وہ بڑی باہمت خاتون تھیں اور زندگی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی عادی تھیں۔ یہ گھر واقعی ان کے لئے جنت نشان تھا۔ خدانخواستہ اگر سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا، بڑے سرد و گرم دیکھتے تھے۔

دونوں ماں بیٹیاں ایسے ایسے مشکل مراحلوں سے گزری تھیں کہ کوئی اور ہوتا تو زندگی سے اوبھ جاتا لیکن ماں جی بہت ہی باہمت تھیں اور یہی ہمت انہوں نے مرینہ میں منتقل کی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لئے جینا سیکھ لیا تھا۔ مرینہ اپنی ماں کے لئے جی رہی تھی اور اس کی ماں اپنی بیٹی کے لئے۔ حالانکہ تنہائیوں میں اس کا دل چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو زندگی سے منہ موڑ لے۔ لیکن اس کے سامنے بیٹی کی شکل آ جاتی تھی۔ مرینہ جس کا اس کائنات میں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مرینہ کو کوئی دیوار مل جائے اور وہ اس کی پشت سے ٹیک لگا لے۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی خواہش ان کی زندگی میں نہیں تھی اور اس سے پہلے مرنا بھی ممکن نہیں۔ تقدیر شاید روٹھی ہوئی تھی یا وقت ناراض تھا یا پھر انہیں زندگی گزارنے کے ڈھنگ نہیں آتے تھے۔ زمانہ سازی تو ان کے اندر تھی ہی نہیں۔ زمانہ ساز ہوتیں تو اپنے گھر میں آنے والی بچیوں کو مفت تعلیم نہ دیتیں۔ پاس پڑوس کے گھروں کی بچیاں پڑھنے آتی تھیں حالانکہ پڑوسیوں نے کتنی ہی بار یہ کہا تھا کہ ماں جی ان کا چھوٹا سا معاوضہ قبول کر لیں بے شک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی لیکن ان کا بھی کام چل جائے گا اور تھوڑے سے پیسوں میں ان کی بچیاں مناسب تعلیم بھی حاصل کر لیں گی۔

"آپ بالکل اطمینان رکھیں علم تو انسان کے پاس اللہ کی امانت ہے میں معافی چاہتی ہوں بے شک ضرورت بہت بڑی شئے ہے لیکن علم کے عیوض میں کوئی معاوضہ

قبول نہیں کروں گی آپ مجھے اس کیلئے مجبور نہ کریں۔"

پڑوسی عش عش کرتے تھے۔ وہ ان کی شرافت کے بے حد معترف تھے اور ہر طرح ان کے کام آنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن آج تک انہوں نے اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دی تھی۔ ابھی کچھ سہارے باقی تھے۔ سونے کے کنگن، کچھ انگوٹھیاں وغیرہ، کپڑے جن پر چاندی کا کام تھا، انہیں پڑوس کی ایک بیوہ خاتون نے خوشی خوشی خرید لیا تھا۔ کوڑیوں کے مول جو مل گئے تھے۔ آج کل سچے کام کا رواج کہاں ہے۔ ایسی چیزیں جو آہستہ آہستہ ساتھ دے رہی تھیں اور زندگی گزر رہی تھی لیکن اس کے بعد کچھ نہیں تھا۔ سوائے مرینہ کے پھر جب مرینہ نے کہا۔

"ماں جی میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔"

"نوکری۔۔۔؟"

"ہاں ماں جی! آپ میرے اوپر بھروسہ کیجئے میں نے وقت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مجھے نوکری کرنے دیں۔ گھر کے حالات سنبھل جائیں گے۔ ماں جی سوچ میں ڈوب ڈوب کر پھونک پھونک کر چلنے کی عادی نہ ہوتیں تو شاید حالات بہت پہلے بگڑ گئے ہوتے لیکن وہ بڑی ہی خوبی سے عزت سنبھالتے ہوئے تھیں۔ البتہ اس بوجھ نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ پلنگ سے لگ گئی تھیں۔ آخر کار انہوں نے اسے اس بات کی اجازت دے دی کہ اگر کوئی ڈھنگ کی نوکری مل جائے تو وہ کر لے اور اسی دن اس نے پڑوسن خالہ سے درخواست کی کہ ان کے گھر آنے والا اخبار تھوڑی دیر کے لئے اسے دیا جائے۔ اس اخبار میں وہ "ضرورت ہے" کے اشتہار پڑھتی تھی اور پھر کوشش کر کے وہاں درخواست ڈال دیا کرتی تھی اور آخر کار اس کے پاس ایک فرم کی طرف سے انٹرویو لیٹر آ گیا تھا۔

دھڑکتے دل کو سنبھالے ہوئے وہ گھر سے باہر نکل آئی۔ عموماً سورج نکل آنے کے بعد دھند کا زور ٹوٹ جاتا تھا لیکن آج دھند اور سورج کی باقاعدہ جنگ ہو رہی تھی اور دھند کا پلہ بھاری تھا۔ ویگن سٹاپ پر رش تھا تاہم اسے مطلوبہ وین میں جگہ مل گئی۔ اسے ایک خاتون کی گھڑی سے وقت کا پتہ چلا اور اس نے اطمینان کی سانس لی،

مناسب وقت تھا۔ اسے دو وینوں سے سفر کرنا تھا۔ پہلی وین سے اُتر کر دوسری وین میں سوار ہوگئی۔ اس وین میں اسے دو لڑکیاں مل گئیں جنہیں اسے علاقے میں اترنا تھا جہاں آرگس امپوریو واقع تھا۔

''ہماری کمپنی بھی آرگس امپوریو کی بغل والی عمارت میں ہے ہم وہیں اتریں گے۔'' ایک ہمسفر لڑکی نے بتایا۔

اسے آسانی ہوئی۔ مطلوبہ جگہ پر لڑکیاں ساتھ اُتر گئیں۔ اس نے انہیں اپنے انٹرویو کے بارے میں بتا دیا تھا اور دونوں لڑکیاں اس کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر کے گئی تھیں۔ اس نے سامنے نظر آنے والے آرگس امپوریو کے سائن دیکھے جن پر سورج کی سیدھی شعائیں پڑ رہی تھیں اور وہ چمک رہے تھے۔ بے ساختہ اس کے دل سے دعا نکلی کہ کاش آج اس کی تقدیر انہیں کی طرح چمک اُٹھے۔

وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس عمارت کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور وہاں سب سے پہلے اس کی ملاقات ایک باوردی چپڑاسی سے ہوئی جو اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جی بی بی صاحبہ؟''

''وہ۔ میں انٹرویو کے لیے آئی ہوں۔''

''ابھی سے بی بی صاحبہ۔''

''ہاں۔ انٹرویو لیٹر میں نو بجے کا وقت لکھا ہوا ہے۔''

''اور آپ نے اس پر یقین کر لیا۔'' چپڑاسی نے ہنس کر کہا۔ پھر بولا ''چلیے آ گئی ہیں تو اندر آ جائیں، سردی زیادہ ہے۔ آ جایئے اندر آ جایئے۔'' چپڑاسی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ بہت خوبصورت ہال تھا۔ چاروں طرف قیمتی فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ فرش انتہائی صاف شفاف تھا۔ اس چپڑاسی کے علاوہ یہاں اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چپڑاسی بولا۔

''بیٹھ جایئے...... ویسے انٹرویو منیجر صاحب ہی لیتے ہیں اور وہ بھی آپ کی طرح وقت کے پابند ہیں، شاید جلدی آ جائیں۔ ویسے میڈم آج کل کے دور میں وقت نام

کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ لوگ وقت دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ بلکہ وقت کی پابندی نہ کرنا اب فیشن ہے۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ وقت دینے والے بھی جانتے ہیں کہ جنہیں وقت دیا گیا ہے وہ بھی وقت کی پابندی نہیں کریں گے۔ ویسے یہاں منیجر صاحب کی وجہ سے تھوڑی سی پابندی ہو جاتی ہے۔ چپڑاسی آٹھ بجے آ جاتے ہیں۔ کلرک تقریباً ساڑھے نو بجے، اکاؤنٹنٹ اور دوسرے افسر اور منیجر صاحب دس بجے تک آ جاتے ہیں۔ جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنی ہی دیر میں پہنچے گا بلکہ اب تو یہی بڑا ہونے کی پہچان ہے۔ آپ بیٹھ جایئے، آرام سے۔'' اس نے کہا اور وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ چپڑاسی اسے وہاں چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ وقت گزرتا رہا، سامنے دیوار پر ایک خوبصورت گھڑی آویزاں تھی، ساڑھے دس بجے سے کلرکوں کی آمد شروع ہوگئی اور وہ مختلف کمروں میں داخل ہو گئے۔ پھر چپڑاسی منیجر صاحب کے ساتھ اندر آ گیا، اس کا اندازہ اس بات سے ہوا تھا کہ چپڑاسی منیجر صاحب کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا اور جس کمرے کے دروازے پر منیجر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی وہ شخص اسی طرف بڑھا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ایک نگاہ مرینہ پر ڈالی تھی اور اس کے بعد دروازہ کھولے ہوئے کھڑے چپڑاسی کو پیچھے ہٹا کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ چپڑاسی بھی اس کے ساتھ ہی اندر پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہی تھی۔ چپڑاسی نے اسے بتایا تھا کہ انٹرویو منیجر صاحب ہی لیا کرتے ہیں، دیکھیں انٹرویو کب شروع ہوتا ہے۔ بہرطور چپڑاسی باہر نکل آیا۔ اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی مگر تھوڑی دیر کے بعد لابی میں لگی ہوئی بیل بجی اور چپڑاسی جلدی سے منیجر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ اور کلرک وغیرہ بھی آ گئے تھے اور ان کے کمروں سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چپڑاسی نے باہر آ کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ منیجر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ بہت شاندار آفس تھا۔ اس نے ایسے دفتر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بڑی سی میز کے پیچھے ادھیڑ عمر منیجر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گہری نگاہوں سے مرینہ کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے تشویش کے آثار اُبھر آئے۔ وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوب گیا

تھا۔مرینہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھی تو وہ جلدی سنبھل گیا اور بولا۔

''جی آیئے بیٹھیے۔''

وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔منیجر نے سامنے رکھا ہوا درخواستوں کی فائل اٹھا لی۔

''ہاں کیا نام ہے آپ کا؟''

''مرینہ بیگ۔''اس نے لرزتی آواز میں جواب دیا اور منیجر درخواستوں کی فائل میں اس کی درخواست تلاش کرنے لگا پھر اس نے درخواست پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''تعلیمی اسناد؟''

''جی یہ موجود ہیں۔''اس نے ساتھ لائی ہوئی سندیں نکال کر سامنے رکھ دیں اور منیجر ان پر نگاہیں دوڑانے لگا پھر بولا۔

''پہلے کہیں ملازمت کی ہے؟''

''جی نہیں۔''

''گویا تجربہ کچھ نہیں ہے لیکن آپ یہ کام سنبھال لیں گی؟''

''جی ہاں مجھے اعتماد ہے۔''منیجر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا کچھ دیر تک وہ خاموش رہا اور ایک بار پھر اس نے سامنے لگی ہوئی بیل کا بزر دبایا اور چپراسی اندر آ گیا۔

''اور کتنی لڑکیاں ہیں باہر؟''

''اور کوئی نہیں ہے صاحب۔''چپراسی بولا اور منیجر نے چونک کر چپراسی کو دیکھا۔

''کوئی نہیں ہے؟''اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا پھر بولا۔

''نصیر صاحب کو اندر بھیج دو۔''چپراسی چلا گیا کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک نوجوان اندر آ گیا تو منیجر بولا۔

''اس بی بی کے علاوہ کوئی اور نہیں آیا نصیر صاحب؟''

''سر! سردیوں کا موسم ہے دیر سے آئیں گی ویسے بھی باہر ابھی تک کہر پھیلی ہوئی ہے۔''

''یہ کہر ان کی تقدیر میں پھیلی ہوئی ہے۔یہ بی بی وقت پر آئی ہیں اس لئے ان کا حق بنتا ہے۔میرے خیال میں یہ موزوں بھی ہیں۔تم ان کے کاغذات تیار کرالو۔جی بی بی ایک بات بتایئے کام تو بے شک آپ کو سمجھا دیا جائے گا کوئی مشکل بات نہیں ہے

میں خود بھی آپ کی مدد کروں گا، آپ یہ بتایئے کہ آپ کے ذہن میں تو کوئی اور بات نہیں ہے؟ میرا مطلب یہ تنخواہ وغیرہ کا معاملہ...... آپ کو ساری تفصیلات ابھی بتا دی جائیں گی۔''

''جی سر میں کام کرنا چاہتی ہوں۔''

''کب سے کام شروع کر سکتی ہیں آپ؟''

''اگر آپ حکم دیں گے تو آج ہی سے سر۔''وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''اچھی بات ہے۔اچھی بات ہے۔آپ وقت پر بھی آئی ہیں اور ویسے بھی مجھے مستعد نظر آتی ہیں۔آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں نے بس سرسری طور پر آپ کو دیکھ کر آپ کو یہ ملازمت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔اصل میں میرا ابھی کچھ تجربہ ہے۔خدا کرے آپ کے سلسلے میں وہ ٹھیک ہو اور آپ کام کریں۔ہاں نصیر صاحب! آپ ان کے کاغذات تیار کر لیں اور چپراسی کو کہہ دیں کہ اب آنے والی خواتین کو واپس کر دے اور ان سے کہہ دے کہ انٹرویو کا وقت نکل گیا ہے وہ آرام کریں۔''

''بہت بہتر جناب۔''نصیر نے اس کی درخواست اور تعلیمی اسناد وغیرہ سنبھال لیں اور اس کے بعد باہر نکل گیا۔

''اب آپ مجھے مختصراً اپنے بارے میں بتا دیجئے وہ باتیں جو دفتری معاملات سے متعلق ہو سکتی ہیں۔کم از کم میں دفتری اوقات میں وقت کی پابندی کا قائل ہوں۔نو بجے انٹرویو کا وقت لکھ دیا تھا لیکن آج غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہے مجھے نو بجے یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔آپ کس وقت یہاں آ گئی تھیں؟''

''نو بجے سے پہلے آ گئی تھی سر۔''

''دیکھئے غلطی میں نے کی ہے، ہم لوگوں نے تھوڑا سا وقت دے دیا ہے یہاں کے اسٹاف کو خاص طور سے سردیوں کے لئے۔لیکن یہ غیر مناسب وقت ہے۔البتہ آپ کو بھی یہ مہلت ضرور دی جائے گی آپ کے گھریلو حالات کیا ہیں؟''

''سر والدہ ہیں میں ہوں اور بس کوئی نہیں ہے۔''

''آپ کا پتہ لکھا ہوا ہے کوئی ٹیلی فون نمبر موجود نہیں ہے آپ کے پاس؟''

"نہیں سر۔"

"ٹھیک ہے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کو ملازمت مل گئی ہے۔ رب نواز صاحب آئیں گے تو میں آپ کے کاغذات ان کے پاس پہنچا دوں گا۔ وہ ہماری فرم کے مالک ہیں۔ آپ کے کاغذات تیار کر کے ان کی میز پر پہنچا دیئے جائیں گے۔ ملازمت کا آخری فیصلہ رب نواز صاحب ہی کریں گے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ فیصلہ آپ کے حق میں ہی ہوگا۔ میں آپ سے چند الفاظ ضرور کہنا چاہتا ہوں۔" منیجر صاحب نے کچھ لمحے خاموشی اختیار کی اور اس کے بعد بولے۔

"گھر سے باہر کا ماحول بہت مختلف ہوتا ہے۔ ہم ابھی اس منزل پر نہیں آئے کہ ہمارے معاشرے کی لڑکیاں آزادی سے اپنے فرائض سرانجام پورے کر سکیں۔ انہیں قدم قدم پر اُلجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن کیا کیا جائے مجبوریاں گھر سے باہر نکال ہی لاتی ہیں۔ کوشش کریں کہ ان مجبوریوں کے لئے اپنی انا اور اپنے وقار کو قربان نہ کرنا پڑے۔ یہ الفاظ ابھی اگر آپ کے ذہن میں نہیں آئے تو باہر بیٹھ کر ان پر غور کر لیجئے، جایئے شکریہ۔ نواز صاحب آئیں گے تو آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔"

"جی سر!" وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی اور اپنی فائل وغیرہ سنبھال کر باہر آ گئی۔ اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ ماں بیٹیاں دنیا کے ہر موضوع پر بات چیت کر لیا کرتی تھیں، ماں جی نے اسے دنیا کے بارے میں بہت کچھ سمجھایا تھا۔ تھوڑی سی انسان شناسی بھی اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ منیجر صاحب کے الفاظ میں کوئی خاص بات ضرور تھی جسے وہ محسوس کر رہی تھی، لیکن سمجھ پا نہیں رہی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی شکل وصورت سے ایک مہربان انسان معلوم ہوتے تھے۔ ممکن ہے یہ عام سی بزرگانہ نصیحت ہو۔ بہرحال نوکری کرنی تھی اور منیجر صاحب نے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ یہ نوکری اسے مل گئی ہے۔ انہوں نے نصیر صاحب کو اس کے کاغذات وغیرہ بھی دے دیئے تھے۔ خدا کرے رب نواز صاحب اس کے تقرر کی توثیق کر دیں۔ بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جتنی شاندار فرم نظر آ رہی ہے اس کی مناسبت سے تنخواہ بھی بہتر ہوگی۔ آہ کاش کوئی مشکل راستے میں نہ آئے۔ کم از کم بہتر طریقے سے ماں جی کا

علاج ہو سکے گا۔ گھر کے معاملات میں کچھ بہتری پیدا ہو جائے گی۔"

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک چالیس بیالیس سالہ خاتون اندر داخل ہوئیں اور ان کے پیچھے پیچھے دو لڑکیاں جنہوں نے بڑا بھونڈا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد تیسری نوجوان خاتون جو بڑا ماڈرن لباس پہنے ہوئی تھی۔ ناک پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ ایک دو اور لڑکیاں اور وہ ماڈرن خاتون سیدھی مرینہ کے پاس ہی آ گئی تھیں اور بیٹھ گئیں۔

"ہیلو آپ بھی انٹرویو کے لئے آئی ہیں؟" انہوں نے مرینہ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"بڑی سویٹ ہیں آپ۔ آپ گر آپ کہیں تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔ کیا کہتی ہیں آپ؟"

"نہیں شکریہ۔ آپ کی مہربانی۔" مرینہ نے ہنس کر کہا۔

"سوچ لیں آپ میرے پاس بہت بڑی سفارش ہے۔"

"جی لیکن آپ کو نوکری کی ضرورت ہوگی۔"

"کوئی خاص نہیں بس تفریحاً (want some change)" اس نے کہا۔

"جی لیکن آپ بہت دیر سے آئی ہیں۔"

"(it doesnt matter) بہت بڑی سفارش ہے میرے پاس۔"

اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور مرینہ کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ بھی وہ جانتی تھی کہ یہ دور سفارشوں کا دور ہے۔ بڑے بڑے فیصلے ملتوی ہو جاتے ہیں لیکن وہ مہربان چپڑاسی جس سے یہاں آ کر ملاقات ہوئی تھی ایک بار پھر اس کے لئے فرشتہ رحمت بن کر آیا اور اس نے کہا۔

"آپ لوگ انٹرویو دینے آئی ہیں؟"

"ہاں۔" دو تین خواتین نے جواب دیا۔

"تو براہ کرم واپس جایئے۔ انٹرویو ہو چکا ہے آپ کو معلوم ہے کہ اس کا وقت نو بجے تھا اور وقت کی پابندی کے بارے میں آپ کو انٹرویو لیٹروں پر لکھ بھی دیا گیا تھا۔"

"لیکن سردیوں کے اس موسم میں نو بجے بستروں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنی

جلدی کون آسکتا ہے اور وہ بھی لاہور کی سردی توبہ توبہ......'' عمر رسیدہ خاتون نے کہا۔

''بی بی جو آتا ہے اسے نوکری مل جاتی ہے۔'' چپراسی نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''تو کیا کسی کا اپائنٹمنٹ ہوگیا؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''جی ہاں ہوگیا۔''

''یہ تو دھاندلی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے یہ تو طریقہ کار ہی نہیں ہے۔'' عمر رسیدہ عورت نے کہا۔

''دھاندلی تو آپ نے کی ہے بی بی۔ نو بجے بلایا تھا آپ تو سوا گیارہ بجے آئی ہیں۔''

''تم ایک کام کرو۔ منیجر صاحب کو میری سلپ دے دو۔'' اس لڑکی نے جو جینز وغیرہ پہنے ہوئے تھی اور تفریحاً ملازمت کے لئے آئی تھی ایک کاغذ نکال کر اپنا نام لکھتے ہوئے کہا۔

''منیجر صاحب تو چلے گئے کسی کام سے آپ کل یہ سلپ لے کر آجایئے۔''

''اور رب نواز صاحب تو ہوں گے۔'' لڑکی کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔

''وہ بھی کل ملیں گے۔'' چپراسی نے کہا۔ وہ خود بھی کافی تیز مزاج معلوم ہوتا تھا کسی سے متاثر نہیں ہو رہا تھا اور پھر شاید وہ مرینہ کی مدد بھی کرنے پر تل گیا تھا۔ بے شک چپراسی تھا لیکن صاحبِ اختیار تھا۔ اس لئے اس نے کسی کی نہ چلنے دی۔ امیدوار خواتین دفتر والوں کو منیجر اور رب نواز صاحب کو خوب برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ البتہ جینز والی خاتون نے چلتے چلتے مرینہ سے کہا۔

''آیئے میں آپ کو مناسب جگہ ڈراپ کر دوں گی۔''

''جی نہیں شکریہ میں چلی جاؤں گی۔''

''میرے پاس کنوینس ہے۔ آجایئے تکلف نہ کریں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

''میں نے کہا نا میرا دوست نیچے موجود ہے میں اسی کی کار میں اس کے ساتھ آئی تھی، آؤ تمھیں اس سے ملاؤں۔ سوئیٹ ہے وہ اور پھر کوئی ملازمت مہیا کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے آؤ ایک ایک کپ چائے پئیں گے اس وقت کہیں بیٹھ کر باہر

کا موسم بہت خوبصورت ہے نوکری نہ ملی تو دوستی ہی سہی۔''

''جی نہیں شکریہ۔'' مرینہ نے کسی قدر خشک لہجہ اختیار کیا تو اس نے مرینہ کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر ہونٹ سکوڑ کر شانے ہلائے اور اس کے بعد واپس چل پڑی۔

مرینہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد چپراسی آ گیا۔

''آیئے مالک آ گئے ہیں۔''

مرینہ کو تھوڑا سا تعجب ہوا، آنے والوں کے لئے یہی لابی کا مین دروازہ تھا۔ سارے کلرک، منیجر اکاؤنٹنٹ وغیرہ اسی دروازے سے آئے تھے۔ یہ رب نواز صاحب کون سے دروازے سے اندر آ گئے۔ بہرحال وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور چپراسی کے ساتھ چل پڑی۔ منیجر کے کمرے سے متصل بائیں جانب ایک چھوٹی سی راہداری تھی اور اس راہداری کا اختتام ایک بڑے کمرے کے دروازے پر ہوتا تھا۔ چپراسی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کر دیا۔ شاندار ایئر کنڈیشنڈ آفس میں گورے چٹے رنگ کا ایک خوش لباس ادھیڑ عمر آدمی موجود تھا، کمرے میں شاندار ہیٹر جل رہا تھا کیونکہ اندر کا موسم بالکل نارمل تھا، باہر جو سردی کی لہر آئی ہوئی تھی اندر اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ لمبی چوڑی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے اردگرد بہت سے ٹیلی فون موجود تھے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر مرینہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سوجھے ہوئے پپوٹے کسی حد تک نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ مرینہ نے اس کی گہری اور دماغ میں اُترنے والی نگاہوں سے ہلکی سی کپکپی محسوس کی تھی۔

''آیئے بیٹھ جایئے کسی کی سفارش لائی ہیں آپ؟'' اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

''جی نہیں۔''

''منیجر صاحب نے آپ کا انتخاب کرلیا ہے۔ انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی۔ ویسے آپ تو خود اپنی سفارش ہیں کوئی اور خاص بات ہو تو بتایئے۔''

''جج...... جی نہیں جناب۔''

''پھر ٹھیک ہے جایئے کام شروع کر دیجئے، میں منیجر کو فون کر دوں گا کہ میں نے

ان کی پسند کو خود بھی پسند کر لیا ہے۔'' عجیب سا لہجہ تھا، الفاظ بھی عجیب تھے، عام انداز سے ہٹ کر لیکن بہرحال اس کے لئے خوشخبری تھی۔

''شکریہ آپ جا سکتی ہیں۔'' وہ بولا اور مرینہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ دہری کیفیت کا شکار تھی۔ ایک طرف مسرت تھی کہ اس کے رگ و پے میں لرزشیں پیدا کر رہی تھی تو دوسری طرف دل کے کسی گوشے میں دماغ کی طرف سے کوئی (Indication) بھی تھی۔ لیکن اس نے اس خوشی کو اپنے وسوسوں پر حاوی کر لیا۔ فرم کے مالک نے بھی اس کی ملازمت کی توثیق کر دی تھی۔ اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ نصیر صاحب نے اس کے کاغذات کی فائل بنوا دی تھی اور پھر اسے اس کی میز پر پہنچا دیا گیا۔ نصیر صاحب بھی بہت مہربان انسان تھے انہوں نے کہا۔

''دیکھیں یہ آپ کی ملازمت ہے۔ بس ذرا اپنے آپ کو سنبھال کر رکھئے گا۔ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ میں آپ کو تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر سمجھائے دیتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ کی تنخواہ کا آغاز نو ہزار روپے سے کیا گیا ہے۔ تین مہینے مکمل ہونے کے بعد اس میں اضافہ کر دیا جائے گا اور آپ کنفرم بھی ہو جائیں گی۔ اب ذرا توجہ کے ساتھ وہ کام سمجھ لیجئے جو آپ کو کرنا ہے۔''

نصیر صاحب مشفق اور مہربان انسان تھے۔ بڑی محبت سے وہ اس کے استاد بن گئے اور انہوں نے اسے اس کا کام سمجھایا۔ پوری لگن اور توجہ سے اس نے ان کی بتائی ہوئی باتیں سنی تھیں اور پھر کام شروع کر دیا تھا۔ مسرت اور خوشی کی لہریں بار بار اس کے بدن کی کپکپی بن جاتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ ماں جی کو کتنی خوشی ہوگی خدا کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔ سارے مسائل ہی دور ہو جائیں گے۔ میں لگن سے کام کروں گی اور ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس طرح پورا دن گھر سے باہر گزارنا اس کی زندگی کا بالکل ہی نیا تجربہ ہے۔ ماں جی تو واقعی خوب پریشان ہوں گی لیکن جب وہ انہیں بتائے گی کہ وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی تو انہیں کتنی خوشی ہوگی۔

شام کو پانچ بجے چھٹی ہوگئی۔ جب وہ اس شاندار عمارت سے باہر نکلی تو خود کو

بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کون کونسی ویگن اسے اس کے گھر تک پہنچا سکتی ہے۔ ویگن بھی وہاں سے آرام سے مل گئی اور پھر جب وہ گھر پہنچی اور بے صبری سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ماں جی بستر پر تھیں اور پڑوس کی ایک خاتون ان کے پاس بیٹھی گرم پانی سے ان کی پسلیوں کی سکائی کر رہی تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر ماں جی کے قریب پہنچ گئی اور اس نے کہا۔

''کیا بات ہے ماں جی خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہوں تمہیں بہت دیر ہوگئی۔''

''ہاں ماں۔ خدا کا شکر ہے ہماری مشکلات دور ہوگئیں۔ نوکری مل گئی آج ہی سے کام بھی شروع ہوگیا۔'' اس نے مسرت سے کپکپاتی آواز میں ماں جی کو خوشخبری سنائی۔ ماں جی خاموش ہوگئیں۔ یہ بیٹا تو نہیں تھا جس کی نوکری کی کوئی خاص خوشی ہوتی انہوں نے بحالت مجبوری گھر کی عزت دہلیز کے باہر نکالی تھی۔ وہ ماں جی کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا جائزہ لئے بولی۔

''اور سب سے بڑی بات یہ ماں جی کہ دفتر کا ماحول بہت اچھا ہے۔ بہت سے لوگ کام کرتے ہیں جن میں لڑکیاں بھی ہیں۔ بڑی اطمینان کی جگہ ہے۔ کسی طرح اُلجھن یا پریشانی نہیں ہے۔ ماں جی کے چہرے کے عضلات میں تھوڑی سی تبدیلی سی رونما ہوئی تھی۔ پاس بیٹھی ہوئی پڑوسن نے کہا۔

''پسلیوں میں بڑی شدت سے درد ہوگیا ہے۔ اس وقت تو حالت بہتر ہے لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کب درد زیادہ ہو جائے۔ صبح سے یہی ہو رہا ہے میری مانو مرینہ کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دو مجھے تو یہ نمونیہ کا درد معلوم ہوتا ہے۔''

پڑوسن خالہ کی بات سن کر وہ لرز گئی۔ آج ہی تو نوکری ملی ہے خدانخواستہ اگر ماں جی کی حالت خراب ہوئی تو انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکے گی اور پھر کسی اچھے ڈاکٹر کا انتظام کہاں سے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لئے خاصے پیسوں کی ضرورت پڑے گی اور پھر اب ذرا کرائے وراۓ کی ضرورت بھی ہوگی۔ پیسے کوئی خاص نہیں تھے پورے مہینے

کے بعد تنخواہ ملے گی۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ ماں جی کی کیفیت اس وقت ذرا بہتر
تھی۔ اس نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیئے اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔
عجیب سا دل ہو رہا تھا۔ ملازمت مل جانے کی خوشی بھی تھی۔ وہاں آفس کے ماحول کا
تصور کرتے ہوئے دل میں بار بار خوشی کا احساس اُبھرتا تھا، جو کام اس کے سپرد کیا گیا
تھا وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بہر طور کافی پریشانیوں میں اُلجھی رہی۔ آج تک پڑوسیوں
سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ ان ماں بیٹیوں کو تو قرض مانگنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا۔ بہت
کچھ سوچا بہت غور کیا اس کے بعد پڑوسن خالہ سے کہا۔

''خالہ جی ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے!''

''ہاں بیٹی بولو۔ مجھے بھی تمہاری نوکری لگ جانے کی بہت خوشی ہے بس رخشندہ
بہن کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشانی ہوتی ہے لیکن تم پھر بھی فکر مت کرو جہاں
تک مجھ سے ہو سکا میں رخشندہ کا خیال رکھوں گی اللہ تمہاری خیر کرے۔''

''خالہ جی میری نوکری تو لگ گئی ہے۔ نو ہزار روپے تنخواہ ہے۔ سارے دلدّر
دُور ہو جائیں گے مگر خالہ جی میری تنخواہ پہلی تاریخ کو ملے گی۔ ہمیں کچھ قرض کی
ضرورت ہے مل جائے گا؟''

''کتنے پیسے چاہیے ہیں بیٹی؟''

''خالہ جی جو بھی ممکن ہو سکے میں پہلی تاریخ کو......'' اس کی آواز حلق میں پھنس
رہی تھی۔ خالہ جی گھر چلی گئیں اور پھر واپس آ کر انہوں نے سو سو کے پانچ نوٹ اس
کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بولیں۔

''بیٹی یہی تھے میرے پاس مجھے افسوس ہے کہ پہلی بار تم نے......''

''نہیں خالہ جی آپ کا بہت بہت شکریہ یہ کام چل جائے گا آگے اللہ مالک ہے۔
اللہ ہی کوئی نہ کوئی سبیل نکالے گا۔''

وہ احتیاط سے پیسے اپنے پاس محفوظ کر کے کام میں مصروف ہو گئی لیکن بہر حال
بہت جلد پتہ چل گیا کہ پانچ سو روپے کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ اسی دن سو روپے ڈاکٹر
کی فیس اور اس کے بعد جو دوائیں آئیں جو انہوں نے لکھی تھی وہ تقریباً ایک سو بیس

روپے کی تھیں۔ دو سو بیس روپے تو اس مد میں خرچ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں
نے دیسی مرغ کی یخنی بنائی تھی۔ نمونیہ ہی تشخیص کیا گیا تھا۔ دیسی مرغی وغیرہ کا
بندوبست ہوا اور اس کے بعد اس کے پاس صرف سوا سو روپے بچے لیکن اس خرچ
کے بعد ماں جی کی رات سکون سے گزری تھی اور دوسری صبح ان کی طبیعت کافی بہتر
تھی۔ اسے بڑا سکون محسوس ہوا اور دوسری صبح وہ مقررہ وقت پر دفتر پہنچ گئی۔ آج بھی
چپراسی اسے دیکھ کر مسکرایا تھا، اس نے کہا۔

''بی بی ایک بات کہوں میں آپ سے۔ میں تو خیر چھوٹا آدمی ہوں چھوٹی ہی
بات کر سکتا ہوں لیکن یہ بات ضرور کہوں گا کہ آپ سے کہ انسان کی اچھائیاں انسان کو
فائدہ ضرور دیتی ہیں۔ آپ اس طرح وقت کی پابندی کریں گی تو آپ کی جگہ الگ بن
جائے گی۔''

وہ خوش ہو گئی پھر اپنی میز پر جا بیٹھی اسے کچھ اور کام دے دیئے گئے لیکن طبیعت
میں ایک چبھن سی ضرور تھی۔ یہ چبھن ماں جی کی بیماری کے بارے میں تھی۔ اگر ماں جی
بیمار نہ ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی، کام چل جاتا لیکن بات پورے مہینے کی تھی۔ ماں جی
کی دوا دو تین دن تک چل جائے گی اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں
آتی تھی۔ بہر حال پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کم از کم یہ سمت بہتر رہنی چاہیے
البتہ اسی رات ماں جی کی حالت پھر خراب ہو گئی۔ رات بھر شدید درد سے تڑپتی رہیں۔
صبح کو کسی قدر سکون نصیب ہوا اور وہ دفتر چلی گئی۔ شام کو ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر جا
کر ماں جی کا حال بتایا تو ڈاکٹر نے تین انجکشن لکھ دیئے۔ انجکشن کی قیمت ساٹھ روپے
تھی۔ ایک سو اسّی روپے کے انجکشن...... کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ خالہ ہی
سے بات کی اور انہوں نے خالو سے دو سو روپے لا کر اور اس کے حوالے کر دیئے۔

اب کرائے کے پیسوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہدایت
کی کہ ہو سکتا ہے پانچ انجکشن اور لگوانے پڑ جائیں۔ یہ انجکشن لگنے کے بعد حالت کافی
بہتر ہو جائے گی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اب تو کوئی صورت باقی نہیں
رہ گئی تھی۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور وہ سوچ سوچ کر دیوانی ہونے لگی۔ پھر اس نے

سوچا کہ انا کو طاق میں رکھے ماں کی زندگی ہر شئے سے زیادہ قیمتی ہے اگر ماں کو کچھ ہو گیا تو...... اس تو کے آگے ایک بھیانک خلا تھا۔ چنانچہ اس روز دفتر آ کر وہ دوپہر کو لنچ ٹائم میں نصیر صاحب کے پاس گئی۔ یہی پہلا انسان تھا جس سے اسے شفقت ملی تھی۔ منیجر صاحب سے تو شاید دوسری بار ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ نصیر صاحب چہرے سے نیک آدمی معلوم ہوتے تھے، اسے دیکھ کر چونکے اور بولے۔

''آؤ مرینہ بیٹھو خیریت...... لنچ نہیں کیا؟''

''میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں جناب۔''

''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''دیکھئے مجھے احساس ہے کہ ابھی نوکری کرتے ہوئے مجھے چار روز بھی نہیں ہوئے لیکن ضرورتیں وقت کے تابع نہیں ہوتیں۔ میں پریشانیوں کی آخری حد تک پہنچنے کے بعد یہ بات عرض کر رہی ہوں کہ مجھے میری تنخواہ میں سے کچھ رقم ایڈوانس دلوا دی جائے۔ پہلی تاریخ کو یہ رقم واپس مل جائے گی۔'' نصیر صاحب نے ہمدردی سے اس کی بات سنی پھر بولے۔

''مجھے آپ کی پریشانیوں کا احساس ہے بی بی لیکن یہاں ایڈوانس کا کوئی رواج نہیں۔ اگر ہوتا تو میں فوراً آپ کی یہ مشکل حل کر دیتا۔ اس لئے میں آپ کو یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا کہ آپ اس سلسلے میں منیجر صاحب کو کوئی درخواست دیں۔ ہاں ایک مشورہ ہے۔ آپ رب نواز صاحب سے بات کر لیں یا ایک پرچہ ان کے نام لکھ دیں اور چپراسی کے ہاتھ اندر بھجوا دیں۔ ذاتی طور پر اگر رب نواز نے چاہا تو آپ کو ایڈوانس دے دیں گے۔''

مرینہ کے اوپر ایک دم اوس پڑ گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا ہو۔ کیا سوچ رہے ہوں گے نصیر صاحب۔ کس طرح کی لڑکی ہے۔ تجربہ تو اسے نہیں تھا لیکن عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں چار دن نوکری کرنے کے بعد منہ کھول دیتی ہیں۔ وہ شدید وحشت کا شکار تھی لیکن ضرورت اسے سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک پرچہ لکھ کر رب نواز کے پاس اندر بھجوا دیا اور آدھے

گھنٹے میں اس کی طلبی ہو گئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ مالک کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ رب نواز کو ایک نگاہ دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ اس وقت اندازہ لگانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی مشکل کا شکار تھی۔ بہر حال دھڑکتے دل کے ساتھ وہ رب نواز کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ بارعب چہرے والے رب نواز نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر پتھریلے لہجے میں بولا۔

''مس مرینہ! یہ وقت میرے لئے شدید مصروفیات کا وقت تھا۔ اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے تو براہ کرم سات بجے تشریف لایئے۔ اس وقت میں آپ کی تحریر پر غور کر سکوں گا۔ اس وقت تو مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''سات بجے آپ دفتر میں مل سکیں گے سر؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں ملوں گا۔'' رب نواز نے کہا اور سامنے رکھی ہوئی فائل پر جھک گیا۔ گویا اس کے بعد اس کے پاس بات کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ وہ بے آواز چلتی ہوئی باہر نکل آئی اور اپنی میز پر جا بیٹھی۔ دل کی کیفیت عجب سی ہو رہی تھی۔ ایک طرح سے متلی بھی آ رہی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ رب نواز کے انداز میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ خیر بڑے لوگ چھوٹے لوگوں سے اسی طرح ملا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ اس کا کام کرے گا بھی یا نہیں۔ ذہن میں عجیب سے وسوسے سر ابھار رہے تھے لیکن وہ خود کو تسلیاں بھی دے رہی تھی۔ رب نواز صاحب نے سات بجے کا وقت دیا تھا۔ یہ دو گھنٹے میں کہاں گزاروں گی! چھٹی کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ گھر جاؤں اور ماں جی سے کچھ کہہ کر واپس آ جاؤں۔ ابھی تو اصل بات بھی بتانا مناسب نہیں ہو گا۔ وہ کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ لیکن رب نواز نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ جانتے ہیں کہ دفتر کا سارا اسٹاف پانچ بجے چلا جاتا ہے پھر وہ سات بجے ان کے پاس کیسے جائے گی۔ لیکن بہر طور پر بڑے لوگ ایسی باتوں کو کہاں سوچتے ہیں۔ پانچ بج گئے۔ وہ دفتر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھ گئی تھی۔ گھر میں داخل ہوئی تو کئی عورتیں جمع تھیں۔ ماں جی کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر صاحب آ کر واپس جا چکے تھے۔ درد کا شدید دورہ پڑا تھا اور صورتحال بہت خراب ہو گئی تھی۔

"دو گھنٹے تک بے ہوش رہی ہیں ماں جی۔ ہم لوگ تو انہیں ہسپتال لے کر جا رہے تھے لیکن پھر محمود کے ابا ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی انجکشن لگائے تب سکون ہوا ہے یہ نسخہ اور بل دے گئے ہیں۔" ایک پڑوسن نے بل اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ چار سو سولہ روپے کا بل تھا اور نسخہ الگ جو دوائیں اسے بازار سے لانی تھیں۔ پڑوسی اسے تسلیوں کے سوا اور کیا دے سکتے تھے۔ نسخہ اور بل اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اب کیا کروں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ماں جی کی چارپائی کے پائنتی پر بیٹھ گئی۔ ماں جی اب بھی آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے تھیں۔ شاید انجکشن میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی۔ وہ تو پڑوسی بہت اچھے تھے۔ خاص طور پر برابر کی خالہ، وہ تو بڑی مہربان تھیں اور بھی بہت سی عورتیں فوراً آ کر گھر سنبھال لیتی تھیں ورنہ نوکری ووکری خاک میں مل جاتی اور اس کی وجہ بھی ان لوگوں کا رویہ اور شرافت تھی۔ ورنہ اس دور میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ بہت ہی بُرا وقت آ پڑا تھا مرینہ پر۔ رب نواز صاحب نے بھی پوری اُمید تو نہیں دلائی تھی بس غور کرنے کے لئے کہا تھا، اگر وہاں سے بھی پیسے نہ ملے تو کیا ہوگا۔ یہ خیال اس کی جان لے رہا تھا۔ ساری دنیا میں ماں جی کے علاوہ اور تھا ہی کون، اگر اگر اگر...... اور اس اگر سے آگے اس کا سینہ پھٹنے لگا۔ اس حالت میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی ماں جی کو نہیں چھوڑتی، لیکن مجبوریاں اسے دوبارہ گھر سے نکال لائیں۔ خالہ سے خیال رکھنے کے لئے کہا تھا اور کہا تھا کہ ایک بہت ضروری کام سے جا رہی ہے۔ پھر وہ ویگن میں بیٹھ کر دوبارہ دفتر کی طرف چل پڑی اور ٹھیک سات بجے وہ آفس کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چپڑاسی کی جگہ اس وقت ایک دوسرے آدمی نے لے لی تھی۔ باقی پورا دفتر خالی پڑا تھا۔ نیا چپڑاسی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور مرینہ کی پھنسی پھنسی آواز اُبھری۔

"سر، سر نواز موجود ہیں؟" اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی پھیل رہی تھی۔ وہ دُھندلائی ہوئی نگاہوں سے چپڑاسی کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی جیسے وہ کہے گا کہ بی بی اب تو سات بج گئے ہیں دفتر بند ہو چکا ہے اور صاحب چلے گئے ہیں۔ وہ یہ جملے کہے گا اور اس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے رک جائے گا لیکن چپراسی نے کہا۔

"آپ مرینہ میم صاحب ہیں۔"

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس چھوڑی۔

"اندر چلی جایئے۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ مرینہ کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ کمرہ اس وقت نیم تاریک سا تھا۔ مدھم روشنی جل رہی تھی لیکن نواز صاحب کمرے میں موجود نہیں تھے۔ ہاں ان کی میز کی پشت پر جو خوبصورت پردہ پڑا تھا اور جس کے پیچھے شاید چند ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کیا ہے عام طور سے وہ صرف ایک آرائشی پردہ نظر آتا تھا لیکن اس وقت وہ ہٹا ہوا تھا اور ایک کھلا دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے روشنی چھلک رہی تھی۔ وہ جھجک کر رُکی تو دوسری طرف سے رب نواز کی آواز سنائی دی۔

"اس طرف آ جایئے مس مرینہ۔"

مرینہ کے پاؤں اُٹھ نہیں پا رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ پاؤں اس کے ہیں ہی نہیں۔ نجانے کس طرح وہ ایک ایک قدم اٹھا کر اس دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک چھوٹا سا لیکن نہایت خوبصورت کمرہ تھا۔ فرش پر گہرے سبز رنگ کا قالین پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف پُرشکوہ مسہری تھی۔ دوسری جانب صوفہ سیٹ جس پر اورنج کلر کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک صوفے پر رب نواز بیٹھا ہوا تھا۔ س کے سامنے کچھ برتن بھی رکھے ہوئے تھے۔ مرینہ کا سر چکرانے لگا۔ وہ اس ماحول کی متوقع نہیں تھی۔ لیکن...... لیکن یہ سب کچھ...... اب اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ اس کا مطلب نہ سمجھتی۔ دل سینے میں کسی معصوم چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اعصاب کہہ رہے تھے کہ واپس نکل کر دوڑ جائے لیکن ضرورت کی موٹی زنجیریں ٹخنوں میں پڑی تھیں اور وہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

"سر آپ نے میرے بارے میں کچھ سوچا؟" اس کی مجبوری بولی۔

"بہت کچھ سوچا ہے آپ کے بارے میں...... آپ تشریف تو رکھیے۔" رب نواز کے موٹے ہونٹوں کے نیچے ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اس کے خوبصورت

خدوخال بھی کچھ عجیب لگ رہے تھے۔ مرینہ کافی فاصلے پر بیٹھ گئی اسے ہول اُٹھ رہے تھے۔ رب نواز نے کہا۔

''میں نے آپ کا پرچہ پڑھ لیا۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں ہے، جتنے چاہئیں لے لیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک لمحہ بھی پریشان نہ رہیں۔ بتایئے کتنے پیسوں کی ضرورت ہے آپ کو......؟'' رب نواز نے جیب سے پرس نکالا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

''سر میری تنخواہ میں سے......''

''گولی ماریئے تنخواہ کو۔ ان پیسوں کا تنخواہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میری اور آپ کی دوستی کا معاملہ ہے یہ لیجئے۔'' اس نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ پرس سے کھینچے اور انہیں مرینہ کی طرف بڑھا دیا۔ مرینہ اپنی جگہ سے اُٹھ نہیں سکی تھی تو وہ خود اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے یہ نوٹ مرینہ کے پاس رکھے ہوئے ہینڈ بیگ میں ڈال دیئے پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''جب بھی آپ کو ضرورت محسوس ہوا کرے مس مرینہ آپ سات بجے یہاں آ جایا کریں، لیکن دن میں مجھ سے رابطہ قائم کر لیا کریں کیونکہ دوسری ضرورت مند لڑکیاں بھی یہاں آتی رہتی ہیں۔'' وہ ہنسنے لگا۔ مرینہ کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ اس کا وجود خاکستر ہوا جا رہا تھا لیکن وہ برداشت کر رہی تھی، خود کو اذیت دے رہی تھی۔ اپنی نگاہوں میں وہ کیا سے کیا بن گئی تھی، اس طرح جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔

''خیر تو آپ میری یہ پیشکش قبول کر لیں آپ کو کبھی تکلیف نہیں ہو گی۔''

''سر میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ میں بہت مجبور اور بے سہارا لڑکی ہوں۔ میری ماں نمونیہ کا شکار ہو گئی ہے۔ سر آپ تصور نہیں کر سکتے کہ میں انہیں کن حالات میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ ان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو......'' اس کی آواز رندھ گئی اور وہ بے بسی سے رونے لگی۔

''اوہو نہیں نہیں مس مرینہ یہ بالکل نہیں چلے گا۔ دیکھئے یہ دنیا دُکھوں کا گھر

ہے۔ یہاں کون دُکھی نہیں ہے؟ سب کو کوئی نہ کوئی دُکھ ہے۔ ویسے میں آپ کی ہر طرح کی مدد کر سکتا ہوں۔ میرے ایک دوست ہیں بہت عمدہ ڈاکٹر ہیں۔ وہ بھی بہت زندہ دل اور خوش مزاج ہیں۔ ان سے آپ کی بھی دوستی کرا دوں گا اور اگر آپ نے انہیں اپنی مٹھی میں لے لیا تو آپ یقین کریں وہ آپ کی امی کا مفت علاج کر دیں گے۔ بہت بڑے اور تجربے کار ڈاکٹر ہیں۔ ہر طرح کا تجربہ ہے انہیں۔ ہر طرح کا...... کیا سمجھیں؟'' اس نے اپنے لہجے میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر صوفے پر کھسک کر مرینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا پھر بولا۔

''اور یہ آپ کی بھول ہے مس مرینہ کہ آپ بے سہارا ہیں۔ انسان خود اپنا سہارا بن سکتا ہے بس اسے تہذیب اور اقدار کے جھوٹے خول سے نکلنا ہوتا ہے اور تہذیب اور اقدار کا یہ خول احمقوں نے انسانوں کے گرد بنا دیا ہے۔ پلیز رونا دھونا چھوڑیے زندگی کو بالغ نگاہ سے دیکھئے۔ زندگی ہنس پڑے گی۔ کیا سمجھیں آپ؟'' اس نے مرینہ کا شانہ دبا کر کہا اور مرینہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

''سر آج مجھے اجازت دے دیں، کل...... کل میں اسی وقت حاضر ہو جاؤں گی میری ماں جی سخت بیمار ہیں۔''

''کل......'' رب نواز کے انداز میں ایک دم تبدیلی رونما ہو گئی۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے پھر وہ بولا۔

''اس قسم کا اُدھار میرے لئے قابل قبول نہیں ہے مس مرینہ۔ میں نے پورا دن آپ کے تصور میں برباد کیا ہے اس شام کی تنہائی میرے لئے عذاب بن جائے گی...... آپ ایسا کیجئے......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مرینہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اس نے اپنا پرس اٹھایا اور دروازے کی جانب دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی پیچھے سے رب نواز کا ہاتھ آئے گا اور اس کی گردن پکڑ لے گا۔ دروازے سے باہر نکلی تو نئے چپراسی نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر پیچھے دروازے کو دیکھنے لگا۔ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی اور رُکے بغیر راستہ طے کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ اسے اپنا پورا بدن برف جیسے پانی میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اسے جیسے اس کا سارا لباس اس کے بدن سے چپک گیا ہو۔ عمارت کے باہر آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا، زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ اپنے آپ کو سنبھال کر وہ ویگن سٹاپ کی جانب چل پڑی۔ یہاں یہ آسانی تھی کہ ویگن آرام سے مل جاتی تھی۔ اس وقت بھی ویگن کھڑی تھی۔ وہ ویگن پر سوار ہوگئی تب کہیں جا کر اسے اعتماد ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا یا رب نواز نے چپراسی کو اس کے پیچھے نہیں دوڑایا۔ ویگن میں اس کے ذہن میں سناٹے پھیلے رہے نجانے کس طرح یہ سفر طے ہوا اور وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔

اندر کے حال سے خدا ہی واقف تھا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا، صرف ماں جی تھیں اور جاگ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس پہنچ گئی۔ خود کو لاکھ سنبھالا لیکن جذبات اُمنڈ پڑے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں جی ہکا بکا ہوگئی تھیں۔

''ارے ارے مرینہ، مرینہ بیٹے نہیں، بیٹا روتے نہیں ہیں۔ بیٹے بیماری تو زندگی کے ساتھ ہوتی ہے ٹھیک ہو جاؤں گی کچھ روز میں۔ تجھے اکیلا تھوڑی چھوڑ جاؤں گی۔ کیوں میرا دل دُکھا رہی ہو۔ روتے نہیں ہیں۔ دیکھ اب تو میری حالت کافی بہتر ہے اور تُو دفتر سے آنے کے بعد کہاں چلی گئی تھی۔ نصرت باجی بتا رہی تھیں کہ دفتر سے آ کر

دوبارہ گئی ہو۔ ماں جی کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کے سینے سے لگی سسکتی رہی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سینے کا سارا بوجھ آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے بہہ جائے اور اس کا دل ہلکا ہو جائے۔ ماں جی بیچاری یہی سمجھتی رہیں کہ وہ ان کی بیماری سے ڈری ہوئی ہے چنانچہ وہ طرح طرح سے اسے تسلیاں دینے لگیں۔ بمشکل تمام اس نے خود کو سنبھالا۔ اسے بہت سے کام کرنا تھے۔ پھر اسے وہ نوٹ یاد آئے جو اس کے پرس میں رکھ دیے گئے تھے۔ آہ! یہ پیسے جس طرح بھی حاصل ہوئے ہیں لیکن اس کے لئے زندگی ہیں۔ جو بھی ہوا ہے وہ اپنی جگہ، آگے کے نتائج کیا ہوں گے یہ اللہ جانتا ہے لیکن اسے اپنے کام تو کرنے ہی تھے ڈاکٹر صاحب کا بل ادا کرنا تھا۔ اس نے ماں جی سے کہا۔

''ماں جی میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں ذرا ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔''

''بیٹا بعد میں چلی جانا، پہلے آئی تھیں، پھر چلی گئی، اب آئی ہو پھر جا رہی ہو۔''

''زیادہ دُور نہیں جا رہی ماں جی۔ آتی ہوں ابھی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ پھر جب واپس آئی تو خالہ جی موجود تھیں۔ ان کے پیسے بھی انہیں واپس کر دیے۔

''ارے پگلی اب ان کی کیا ضرورت ہے رکھ لو ابھی۔ کوئی جلدی نہیں ہے بعد میں دے دینا۔''

''نہیں خالہ ضرورت ہوئی تو پھر لے لوں گی۔ دفتر سے ایڈوانس لینے گئی تھی۔ بات کی تھی میں نے۔ ایڈوانس مل گیا ہے۔ آپ رکھ لیں۔'' اس نے کہا اور پانچ سو کا نوٹ خالہ کے حوالے کر دیا۔ لفظ ایڈوانس نے پھر اس کے دل پر چرکہ لگایا تھا۔

تاہم اس نے ضبط کیا۔ ماں جی کی حالت خاصی بہتر نظر آ رہی تھی۔ چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر وہ ان سے کچھ فاصلے پر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی اور چکرائے ہوئے دماغ سے ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگی۔ اب کیا ہوگا۔ رب نواز تو بہت ہی بُرا انسان ہے کیا سوچوں میں اس شخص کے بارے میں۔ دنیا کے بارے میں اس کا تجربہ ایک ہی تھا، بے غرض، بے لوث۔ ہمدردی کے الفاظ کتابوں اور

کہانیوں میں تو ملتے ہیں حقیقی دینا میں کیا اب ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ تجربہ تو وہاں جا کر ہی ہوتا ہے۔گھر کی چاردیواری جیسی بھی ہو محفوظ ہوتی ہے۔''

بہترین پڑوس تھا،لوگ ایک دوسرے کی خبر گیری رکھتے تھے،بے شمار گھروں میں جوان لڑکیاں تھیں، لیکن کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جو قابل ذکر ہوتا۔لیکن گھر سے باہر کی دنیا اس چاردیواری سے بالکل مختلف تھی۔ٹھیک تو ہے لوگ محنت کرتے ہیں، دولت کماتے ہیں اور اسے اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ دنیا تو ضرورت مندوں سے بھری پڑی ہے اگر یونہی لٹانے پر آؤ تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہے۔تم دوسرے کی ضرورت پوری کرو اور دوسرا تمہاری، رب نواز کو اپنی دولت کا عیوض چاہیے تو ٹھیک ہے وہ زبردستی تو نہیں کرتا، اپنی دولت خرچ کر کے کسی کے کچھ لمحات خریدتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس دولت عیوض اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہو، یہ سوال بے حد بھیانک تھا اور اس کے پس منظر میں بڑی بڑی ڈراؤنی شکلیں چھپی تھیں یہ رات کچھ زیادہ ہی تاریک اور سنسان تھی یا پھر یہ دل کی ویرانی تھی۔ مستقبل کی تاریکی تھی جو فضا پر چھا گئی تھی۔نجانے کب تک وہ ان وحشت ناک اندھیروں میں جاگتی رہی اور پھر کب نیند آ گئی ذہن کوئی مناسب بات نہیں سوچ سکتا تھا کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مناسب کیا ہے اس کا تو کوئی تعین ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔مشورہ دینے والا نہیں تھا۔کسی کو دل کی بات نہیں بتا سکتی تھی، صبح کو ماں جی آواز سنائی دی۔

''مرینہ اُٹھو گی نہیں بیٹا۔ اذان ہو چکی ہے۔'' اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وضو وغیرہ کر کے اس نے جائے نماز بچھائی مگر آج اس نے کوئی دعا نہیں مانگی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا مانگے۔ یہی سوچ دماغ پر سوار تھی کہ دفتر جائے یا نہ جائے اور پھر آخری فیصلہ یہی کیا کہ اب اگر لڑائی شروع ہو گئی ہے تو لڑا جائے فتح یا شکست کا انتظار کیا جائے چنانچہ وہ قوت پر تیار ہو کر چل پڑی اور دفتر پہنچ گئی۔دل کی کیفیت اللہ ہی جانتا تھا۔کام کرتے کرتے گردن اُٹھا اُٹھا کر ایک ایک کو دیکھنے لگتی تھی کہ کوئی نگاہ مشکوک تو نہیں ہے۔کوئی گزری ہوئی شام سے واقف تو نہیں ہے۔لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔کسی کی توجہ اس پر نہیں تھی۔نصیر صاحب بھی اس کی ضرورت کو بھول گئے تھے۔کون کسے یاد

رکھتا ہے کون کسی کے لئے پریشان ہوتا ہے ہاں اگر اس کی یہ درخواست منظور یا نامنظور ہو کر آتی تو نصیر صاحب ضرور اسے اس کی اطلاع دیتے۔سارے کام حسبِ معمول رہے۔ دوپہر کو لنچ ٹائم میں بھی وہ کام ہی کرتی رہی۔ بھوک کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ دفتر اسے خوف کا گھر لگ رہا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا جا رہا تھا کہ ابھی رب نواز کا چپراسی آئے گا اور اس سے کہے گا کہ رب نواز صاحب نے اسے بلایا ہے۔ پھر پانچ بج گئے اور وہ خوفزدہ سی باہر نکل آئی۔ جب تک ویگن میں نہیں بیٹھ گئی اسی خوف کا شکار رہی کہ اب اسے کوئی بلانے آئے گا اور کہے گا کہ ٹھیک سات بجے نواز صاحب آپ کا انتظار کریں گے لیکن کوئی نہیں آیا۔ ابھی تو زبان کی ساکھ باقی ہے۔ اس نے رب نواز سے کہا تھا کہ اسے جانے دے وہ کل آ جائے گی۔ مصیبت کا دن کل کا ہو گا۔کل کا دن۔ آہ کتنے بوجھ ہیں میری زندگی پر۔

گھر کے دروازے کو دور سے دیکھا۔ دل میں اسی خوف کا احساس رہتا تھا کہ دروازے کے آگے لوگ جمع ہوں گے۔ کوئی کچھ کہہ رہا ہو گا کوئی کچھ۔ گھر میں داخل ہوئی تو ماں جی کو دیکھ کر بڑا سکون ہوا۔ وہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج دن بھر درد نہیں ہوا تھا اور ان کے چہرے پر سکون نظر آ رہا تھا۔ ماں جی کی اس کیفیت نے اسے تھوڑا سا سکون دیا اور وہ اپنی پریشانی بھول گئی۔ انہیں چائے بنا کر پلائی اور ان سے باتیں کرتی رہی لیکن سات بجے کے قریب اس کے دل پر بڑی وحشت تھی اور پھر کیسے رات گزاری کیسے نیند آئی اور کس طرح خوف کا دوسرا دن شروع ہو گیا۔ اس دن دفتر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم لرز رہے تھے۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ نوکری بے حد قیمتی تھی اس کے لئے، بڑی مشکل سے ملی تھی اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر نوکری چھوڑ دیتی تو بھیانک حالات پھر گردن پکڑ لیتے۔ پہلی تاریخ کو نو ہزار روپے ملیں گے اور یہ نو ہزار روپے اسے اور اس کے گھر کو نئی زندگی بخش دیں گے۔ وہ بھی انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں گے جبکہ پچھلے طویل عرصے سے صرف خوف اور وسوسے زندگی سے چپکے ہوئے تھے۔ پیسے کے بغیر تو ایک قدم چلنا مشکل ہے۔ اندازہ ہو چکا تھا ماں جی ٹھیک ہو گئیں۔ اگر علاج نہ ہوتا تو مر بھی سکتی تھی

اور وہ کسی بھی قیمت پر انہیں کھونے کو تیار نہیں تھی۔ پھر اس دنیا میں اس کا کون رہ جائے گا۔ جن حالات سے وہ گزر چکے تھے انہیں یاد کر کے اس کا دل خوف سے لرزنے لگتا تھا۔ آہ! اگر اس دنیا میں ماں جی نہ ہوں تو میرا کیا ہوگا۔

اس وقت تقریباً ساڑھے چار بجے تھے جب چپراسی اس کے پاس پہنچا۔ وہ کسی کام میں منہمک تھی۔

''مرینہ بی بی آپ کو بڑے صاحب نے بلایا ہے۔'' چپڑاسی نے یہ جملے سادگی سے کہے تھے لیکن مرینہ کے سر پر بم پھٹا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس پر کوئی چٹان گر پڑی ہو اور وہ اس چٹان کے نیچے دب گئی ہو۔ اس نے زور سے میز کی سطح پکڑ لی اور دیر تک چکراتے ہوئے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ چپراسی اسے یہ اطلاع دے کر آگے بڑھ گیا تھا اور اب کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں لیکن یہ وقت تو آنا ہی تھا۔ آخر کب تک بچتی رہتی۔ ہمت سے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آنے والے خوفناک لمحات کے لئے تیار کرتی رہی پھر اُٹھی اور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی رب نواز کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ چپراسی نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ رب نواز صاحب کی میز کے پچھلے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا اور خود رب نواز صاحب فائلوں پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ میز سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد نواز صاحب نے کاغذ سرکائے اور قلم بند کر کے رکھ دیا۔ ان کے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ پھر انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ کی والدہ اب کیسی ہیں مس مرینہ؟''

''ٹھیک ہیں سر۔''

''کل کیوں نہیں آئیں آپ؟''

''جی...... وہ......''

''میں نے پوچھا کہ کل آپ کیوں نہیں آئیں؟''

''جس مقصد کے لئے سر آپ مجھے بلانا چاہتے تھے اس کے لئے میں بیکار

ہوں۔ میں حالات کا شکار ایک غریب لڑکی ضرور ہوں، فاحشہ نہیں ہوں۔'' اس نے ہمت کر کے کہا۔

''لیکن آپ نے وہ روپے تو قبول کر لئے تھے مرینہ صاحبہ۔'' رب نواز کا لہجہ سپاٹ تھا، جیسے دو پتھر آپس میں رگڑ رہے ہوں۔

''وہ میری ضرورت تھی، آپ انہیں میری تنخواہ سے کاٹ لیں۔''

''اس وقت آپ نے یہ بات نہیں کی تھی بلکہ آپ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی تھیں۔''

''اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔''

''کیا یہ بدمعاملگی اور بے ایمانی نہیں تھی، اس کا مطلب ہے کہ آپ قابل اعتماد نہیں ہیں۔'' رب نواز صاحب نے کہا۔

''آپ چاہیں تو عزت بچانے کو بے ایمانی کہہ سکتے ہو رب نواز صاحب کیونکہ آپ کے نزدیک عزت کا مفہوم مختلف ہے میں مجبور اور بے سہارا ہوں لیکن بھیڑیوں کا شکار نہیں بن سکتی۔''

''کمال ہے مس مرینہ۔ آپ مجھے گالیاں دینے پر اُتر آئیں، حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے آپ سے۔ آپ نے اپنی ضرورت مجھ سے کہی اور میں نے اپنی آپ سے۔ ہم دونوں کے درمیان ایک سودا ہوا اور آپ اس سودے میں بے ایمانی پر اُتر آئیں۔ اس کے بعد آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں اور پھر بھی آپ خود کو شریف اور نیک نفس اور مجھے بھیڑیا کہہ رہی ہیں اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں تھی تو آپ وہ روپے قبول نہ کرتیں اور یہاں سے چلی جاتیں۔''

''میری مجبوری نے مجھے خاموش کر دیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ مس مرینہ۔''

''سر یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا آپ اچھی طرح اس بات پر غور کر لیں سمجھے آپ۔'' مرینہ نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی اس کا بدن لرز رہا تھا۔ یہ نوکری تو گئی اس نے سوچا۔ خیر اللہ مالک ہے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے

گا۔ رب نواز کی باتوں میں سچائی تو تھی۔ وہ سب کہا تھا اس نے جو ہوا تھا لیکن مجبوری
کی یہ قیمت نہیں ہوتی کہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا جائے۔ کیا اس کائنات میں عزت کی
روٹی کمانا اتنا مشکل ہے۔ کیا لڑکیوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ درکار نہیں
ہے۔ وہ اپنی میز پر جا کر بیٹھ گئی اور پھر اس کے اندر بغاوت کا سا ایک جذبہ پیدا ہوا جو
ہو گا دیکھا جائے گا۔

رب نواز نے جو چاہا تھا وہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی اور ایک بُری بات کے
جواب میں اس نے جو کچھ کیا وہ بھی بُری بات نہیں ہے۔ ملازمت رہے یا جائے
حالات کا مقابلہ کیا جائے گا۔ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا لیکن کچھ نہ ہوا کوئی بات نہ ہوئی
وہ نوکری پر آتی رہی۔ اس واقعے کو تین چار دن گزر گئے تو اس نے سوچا کہ بڑا آدمی
بزدل ہی ہوتا ہے۔ رب نواز صاحب کے دل میں اس کے لئے نفرت تو ہو گی لیکن وہ
کان دبا کر بیٹھ گئے اگر اس کے خلاف کوئی کاروائی کرتے تو ان کی حقیقت بھی تو سامنے
آتی۔ پانچویں دن گیارہ بجے کے قریب چپراسی نے اسے پھر رب نواز صاحب کا پیغام
دیا تو وہ بھونچکی رہ گئی۔ ان چار دنوں میں اسے جو تقویت ملی تھی وہ پھر ڈانوا ڈول ہو
گئی۔ بہرحال مالک نے طلب کیا تھا جانا اس کا فرض تھا وہ اٹھ گئی۔ رب نواز صاحب
کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھے، شاید باتھ روم میں تھے۔ وہ
کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد رب نواز صاحب واپس آ گئے ان کا
چہرہ حسب معمول سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

''جی آپ نے سوچا ہو گا مس مرینہ کہ میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور یقیناً آپ
نے میری اس خاموشی کو میری بزدلی پر محمول کیا ہو گا؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

''پھر کیا سوچا تھا آپ نے؟'' وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''میں نے سوچا شاید آپ کو میری مجبوری پر رحم آ گیا ہے۔'' اس نے نگاہیں
جھکائے جھکائے کہا۔

''رحم دوسری چیز ہے محترمہ!! اگر آپ سمجھ سے کام لیتیں تو آپ کی ساری

مجبوریاں دور ہو جاتیں۔ آپ کا عہدہ بڑھ جاتا۔ تنخواہ بڑھ جاتی۔ اگر آپ ایک ماہ میں
تین چار بار بھی دفتری اوقات کے علاوہ مجھ سے ملاقات کر لیتیں تو ہزاروں روپے کی
آمدنی الگ ہوتی۔ نجانے کیوں آپ جیسے لوگ احمقوں کی جنت میں زندگی گزارنے کی
شوقین ہوتے ہیں۔''

''اگر یہی سب کچھ کرنا ہوتا رب نواز صاحب تو اس کے لئے پھر آپ ہی رہ
گئے تھے۔ میں کہیں بھی یہ سب کچھ کر سکتی تھی۔''

''گویا اب بھی آپ کی سوچ میں لچک پیدا نہیں ہوئی ہے؟''

''میں پہلے بھی آپ کی اس ناپاک پیشکش پر لعنت بھیج چکی ہوں اور میری
درخواست ہے کہ آئندہ آپ میری یوں توہین نہ کریں ورنہ میں آپ کے خلاف سخت
قدم اُٹھاؤں گی۔'' وہ غرا کر بولی۔

رب نواز صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے میں بے ایمانوں کو معاف کرنے
کا عادی نہیں ہوں کیا سمجھیں آپ۔ لیجئے یہ فائل اکرام احمد صاحب کو دے دیجئے۔''
اس نے ایک فائل اٹھا کر مرینہ کو دے دی۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا چہرہ
لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ رب نواز نے پھر اس کے ذہن میں کھولن پیدا کر دی تھی۔ اس کے
وجود میں پھر بے بسی اُبھرنے لگی تھی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ یہ نوکری تو نہیں جہاں وہ
ہر وقت ذہنی کرب اور خوف کا شکار رہے جب بھی اسے رب نواز کی صورت نظر آئے گی
وہ خوفزدہ ہو جائے گی، ایک چور کی طرح زندگی گزارنے سے کیا فائدہ۔ پھر کیا کروں یہ
نوکری چھوڑ دوں۔ اللہ مالک ہے کوئی دوسری مل جائے گی۔ کرب کے عالم میں تو زندگی
نہیں گزاری جا سکتی۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ کر تھوڑی دیر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی
رہی پھر فائل لے کر اکرام صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئی جو یہاں منیجر تھے۔
وہاں بھی منیجر صاحب کے پاس چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ فائل منیجر کے
حوالے کر کے خاموشی سے باہر آ گئی۔ وقت گزرتا رہا اس نے فیصلہ کیا کہ لنچ میں گھر
چلی جائے گی، امی سے کوئی بہانہ کر دے گی کہہ دے گی کہ اسے ٹرائل پر رکھا گیا تھا، کام

مشکل تھا اس لئے وہ نااہل قرار دے دی گئی۔ صحیح حالات اگر انہیں بتا دے گی اور اگر وہ ملازمت نہیں کرے گی تو پھر زندگی کیسے گزرے گی۔ نصیر صاحب کچھ کام لے کر آئے تھے اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں لنچ میں چلی جاؤں گی نصیر صاحب مجھے کچھ کام ہے۔"

"اوہو کیا بڑے صاحب سے چھٹی لے لی ہے مجھے علم نہیں تھا۔" نصیر صاحب نے کہا اور پھر وہ واپس چلے گئے۔ وہ بیٹھی سوچتی رہی، لیکن ابھی لنچ میں آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ چپراسی کسی قدر بدحواس سا اس کے پاس آیا۔

"بی بی آپ کو رب نواز صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

"کیا مطلب کیوں بلا رہے ہیں میں مصروف ہوں ابھی نہیں آ سکتی۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"میری بات سنیئے میڈم۔" چپراسی نے پریشان لہجے میں کہا۔

"جاؤ کہہ دینا نہیں آتی۔" وہ کرخت لہجے میں بولی۔ چپراسی چلا گیا لیکن چند لمحات کے بعد وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آیا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر مرینہ ہکا بکا رہ گئی۔ دفتر کے دوسرے لوگ بھی سنسنی خیز کانسٹیبلوں کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ بھلا دفتر میں پولیس کا کیا کام۔

"مس مرینہ آپ ہیں؟" ایک پولیس والے نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"ہم آپ کی تلاشی لیں گے۔" کانسٹیبل بولا اور مرینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ سحر زدہ سی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ منیجر اکرام احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ کانسٹیبل اس کی میز کی درازیں ٹٹولتے رہے۔ پھر سب سے آخری دراز میں ایک سرخ لفافے پر ہاتھ مار کر انہوں نے ایک لفافہ نکال لیا، کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی رکھی ہوئی تھی۔ منیجر اکرام صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اس کی آنکھوں میں شدید حیرت جھانک رہی تھی۔ پھر ایک کانسٹیبل نے منیجر صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ لفافہ آپ کی موجودگی میں برآمد ہوا ہے منیجر صاحب۔"

"تشریف لائیے شریف زادی۔" دوسرے کانسٹیبل نے حقارت سے مرینہ کو مخاطب کر کے کہا اور اس کا بازو پکڑ لیا اب اسے یہ حق پہنچتا تھا۔

مرینہ کے حواس ساتھ چھوڑ گئے ایک بات سمجھ میں جو آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا نرم بازو کانسٹیبل کے آہنی پنجے میں دُکھ رہا تھا، لیکن وہ اس تکلیف کو بھول گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عالمِ خواب میں ہو، کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو، پھر جو کچھ ہوا اس کی آوازیں اس کے کانوں میں آتی رہیں لیکن وہ خود جیسے ان سے لاتعلق ہو گئی تھی۔

"جی ہاں یہ لڑکی ایک ہفتے قبل ملازم رکھی گئی ہے۔" یہ رب نواز کی آواز تھی۔

"کس کی معرفت سے آئی تھی سر؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں انٹرویو میں کامیاب ہوئی تھی۔"

"کیا یہ آپ کے دفتر میں آئی تھی؟"

"ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس وقت باتھ روم میں تھا۔"

"یہ رقم کہاں رکھی تھی؟"

"میز کی دراز میں۔"

"ہاں نصیر صاحب آپ کیا بتا رہے تھے؟"

"یہ لنچ ٹائم کا انتظار کر رہی تھی، میں کوئی کام لے کر اس کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ وہ لنچ میں چلی جائے گی۔"

"خیر ان باتوں کی ضرورت بھی نہیں آپ کی رقم اس کے پاس سے برآمد ہو گئی ہے۔ ذرا اس کی شکل دیکھیں۔ صورت سے تو شریف معلوم ہوتی ہے لیکن اس قسم کی لڑکیاں...... کمال ہے جناب آئندہ آپ کوئی نیا اپائنٹمنٹ کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھا کریں۔ یہ دوپہر کو یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی تاکہ رقم آرام سے استعمال کر سکے۔"

"میرے خیال میں یہ ضرورت مند تھی، لیکن بیوقوف نے پانچ لاکھ پر ہاتھ

صاف کرنے کی کوشش کی پانچ لاکھ تو اس طرح ضائع نہیں کیے جا سکتے تھے۔ تھوڑی بہت رقم ہوتی تو شاید میں خاموشی اختیار کر لیتا اور آپ کو تکلیف نہ دیتا انسپکٹر صاحب۔''

''یہ ضرورت مند تھی؟''

''ہاں۔ شاید اس کی ماں بیمار ہے۔ اس نے ملازمت پر آتے ہی دوسرے تیسرے دن ایڈوانس مانگنے کی درخواست دی تھی، وہ درخواست کا کاغذ بھی شاید میرے پاس ہی موجود ہے، دیکھئے تلاش کرتا ہوں۔'' رب نواز صاحب نے کہا اور پھر میز کی دراز سے درخواست والا کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔

''خوب مگر یہ پانچ لاکھ کا ایڈوانس تو کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔'' انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسے ناپاک وجود قابل برداشت نہیں ہوتے انسپکٹر۔ ایسی لڑکیاں دوسری شریف لڑکیوں کا بھرم بھی کھوتی ہیں۔'' رب نواز صاحب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''فکر نہ کریں ہم اس کی اچھی طرح اصلاح کر دیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب میرے لائق کوئی خدمت ہو تو......''

''ضرور ضرور آپ کو تکلیف دیں گے اجازت دیجئے۔'' انسپکٹر نے کہا اور پھر کانسٹیبل بولا۔

''چلو اسے ہتھکڑیاں ڈال کر لے چلو۔''

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑیں تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے رب نواز کو دیکھا۔ رب نواز صاحب کی آنکھوں میں ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی، کانسٹیبلوں نے کہا۔

''چلو بی بی چلو۔''

''کہاں کہاں چلوں۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیخی، ''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی میں...... ماں جی ماں جی۔'' وہ دیوانہ وار چیخنے لگی اور دفتر کے تمام لوگ کمرے کے دروازے پر جمع ہو گئے۔

''آپ لوگ کام کریں، اس لڑکی نے رب نواز صاحب کی میز سے پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈی یعنی پورے پانچ لاکھ چرائے ہیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ کانسٹیبل گھسیٹنے لگے، لیکن وہ چند قدم چل کر لڑکھڑائی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی۔ اس کے بعد اسے تھانے میں ہی ہوش آیا تھا، لیکن کاش ہوش کے بجائے موت آ گئی ہوتی۔ تھانے کے کسی کمرے میں ایک بینچ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک لیڈی کانسٹیبل کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بے حد کرخت چہرہ تھا اس کا، ہمدردی یا محبت کے تاثرات سے بالکل عاری۔

''کیسا حال ہے بی بی؟'' اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ کیسا حال تھا، وہ جانتی تھی یا خدا۔ لیڈی کانسٹیبل نے بھی دوبارہ اپنے سوال کا جواب نہیں مانگا اور کرخت لہجے میں بولی۔

''چل اُٹھ۔'' وہ ہمت کر کے اٹھ گئی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اس کی کلائی پکڑی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ حوالات کے دو حصے تھے ایک مردوں کے لئے دوسرا عورتوں کے لئے۔ لیڈی کانسٹیبل نے عورتوں والے حصے میں لے جا کر اسے لاک اپ میں بند کر دیا اور سلاخ دار دروازہ بند کر کے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ روشنیاں جل اُٹھی تھیں لیکن یہ روشنیاں دل پر ایسا بوجھ ڈال رہی تھیں جو ناقابلِ برداشت تھا۔ اب تو رونے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا، تقدیر کی سزا آنکھوں کو کیوں دی جائے۔ رونے سے فائدہ۔ ایک آہ اس کے دل سے نکل گئی اور اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

''میں بے قصور ہوں مالک اب جو تیرا جی چاہے کر۔''

اس کے بعد وہ کوٹھری کے کونے میں زمین پر جا بیٹھی۔ رات گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ سلگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیالات آ رہے تھے ماں جی کو اب کسی نہ کسی حادثے کا یقین ہو گیا ہو گا۔ جتنی دیر گزر گئی ہے اور جتنا وقت ہو گیا ہے اتنا وقت آفس میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بیچاری رونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ پڑوس میں کسی سے کہا ہو گا لیکن وہ لوگ بھی کیا کریں گے۔ دفتر بند ہو چکا ہو گا کہاں سے معلوم کریں گے میرے بارے میں اور پھر کون تگ و دو

کرے گا میرے لئے۔ یہ دنیا تو بالکل ہی بیکار جگہ ہے بس اپنے لئے جی رہے ہیں۔
لوگ کہ مر نہیں سکتے فضول اور بیکار۔ کوئی فائدہ نہیں ہاں جینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ماں
جی میں اور کیا کر سکتی ہوں آپ کا بھی اللہ حافظ جیسی گزرے گزار لیجئے اور مر جائیے۔
پھر ہم لوگوں کی تقدیر میں اس کے علاوہ اور ہے کیا؟ دل میں ایک گولہ سا بنا اور آنکھیں
بے قابو ہو گئیں۔ اب ماں جی کو مرنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس کے تصور میں ماں
جی کی میت تھی۔ کلمہ طیبہ کا ورد ہو رہا تھا۔ کافور اور اگربتیوں کی بُو اس کی ناک میں بسی جا
رہی تھی۔ دنیا کے دُکھوں سے مرجھایا ہوا چہرہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ آخری
دیدار کیلئے کفن کھول دیا گیا تھا۔ لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ صرف وہ تھی جسے وہ چہرہ
دیکھنا چاہیے تھا، ہاں میں ماں جی کو کہاں سے دیکھ سکتی ہوں۔ لوگوں نے چہرہ ڈھک دیا
اور میت لحد میں اُتار دی گئی۔ اس کے بعد مٹی کا ایک تودہ رہ گیا اور بس......

وہ سسک سسک کر روتی رہی اور رات سلگتی رہی۔ نجانے اس وقت کیا بجا تھا
جب دروازہ کھولا گیا، وہ سپاہی تھے جنہوں نے اسے باہر آنے کے لئے کہا۔ وہ باہر نکل
آئی۔ نجانے کہاں سے ہمت پیدا ہو گئی تھی نہ قدموں میں لغزش تھی نہ دل میں خوف۔
بس پورے ماحول سے ایک بیزاری سی تھی۔ وہ انچارج کے کمرے میں پہنچا دی گئی۔
وہی انسپکٹر تھا جس نے اسے گرفتار کیا تھا۔ اس نے ایک فائل سامنے رکھ دیا۔

”یہاں دستخط کرو۔“ اس نے ایک جگہ انگلی رکھ دی اور قلم اس کی طرف بڑھا دیا
قلم لے کر اس نے دستخط کر دیئے۔ کوئی بحث بیکار تھی سوائے اس کے کہ اپنی ذات کے
لئے عذاب خرید لیا جائے۔ صاحبِ زر مالک تقدیر بھی ہوتے ہیں لگتا ہے کاتبِ تقدیر
کا عہدہ انسانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جواب تقدیر کے حکمراں ہیں اور زندگیوں کے
فیصلے ان کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ وہ دواؤں میں ملاوٹ کر کے، غذاؤں میں ملاوٹ
کر کے بیماریاں تقسیم کرتے ہیں۔ اجناس اور دوسری ضروری چیزوں کو ذخیرہ کر کے
بھوک اور افلاس پھیلاتے ہیں۔ جس سے خوش ہوں اس کے وارے نیارے ہوں اور
جس سے ناخوش ہوں زندگی اس پر بوجھ بنا دیں۔ یہی ہوا تھا ایک صاحبِ زر نے
ناخوش ہو کر خدا کی زمین تنگ کر دی تھی اس کے لئے آزادی چھین کر سلاخوں میں محصور

کر دیا تھا۔

”اگر تم چاہو تو عدالت میں اپنی صفائی میں بیان دے سکتی ہو، لیکن اس وقت
تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اس چوری کا اقرار کر لو ورنہ اس چوری کا اقرار کرانے
کے لئے پولیس کو تم پر تشدد کرنا پڑے گا۔“ انسپکٹر نے کہا وہ خاموش رہی انسپکٹر بولا۔

”کیا واقعی تم نے رب نواز صاحب کی میز کی دراز سے یہ لفافہ نکالا تھا؟“

”آپ یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں انسپکٹر صاحب؟“ اُس نے پوچھا۔

”اس لئے کہ میرا دل تمہیں چور نہیں مان رہا۔ لیکن تمہیں خود معلوم ہے کہ یہ لفافہ
سب کے سامنے تمہاری میز کی دراز سے برآمد ہوا تھا۔ رب نواز صاحب نے مجھے بلایا
تھا اور کہا تھا کہ ان کی میز کی دراز سے پانچ لاکھ روپے چوری ہو گئے ہیں یہ رقم معمولی
نہیں ہوتی مگر ایک بات بتانا پسند کرو گی مجھے؟“

”جی۔“

”رب نواز تمہارے اتنے خلاف کیوں ہیں؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کو
دیکھنے لگی انسپکٹر نے پھر کہا۔

”میں نے تمہاری سفارش بھی کی تھی ان سے میں نے کہا تھا کہ ممکن ہے وہ اتنی
ضرورت مند ہو اور مجبوری نے اس لڑکی کو اس کام کے لئے مجبور کیا ہو رقم تو برآمد ہو ہی
گئی ہے۔ اگر وہ اجازت دیں تو کیس رجسٹر نہ کیا جائے زیادہ سے زیادہ ایسا کریں کہ
تمہیں نوکری سے نکال دیں لیکن رب نواز صاحب نے سختی سے کہا ہے کہ تمہارے
خلاف پورا کیس بننا چاہیے اور کوئی رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس
طرح کے ملزموں کو چھوٹ نہیں دے سکتے شاید کسی بات پر ناراض ہیں وہ تم سے۔“

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی انسپکٹر۔“ اس نے گردن جھکا کر کہا۔

”کوئی ضمانت کر سکتا ہے تمہاری نقد ضمانت ہو گی۔“

”کوئی نہیں کر سکتا۔“

”تمہارے والد صاحب، میرا مطلب تمہارے عزیزوں میں سے کوئی ہے۔“

”ماں جی کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ سخت بیمار ہیں۔“

سب انسپکٹر تمہارا پتہ نہیں لے سکا ہے۔ تم پتہ بتا دو، تمہارے گھر اطلاع کر دی جائے گی۔ ممکن ہے تمہاری ماں لوگوں سے کہہ کر تمہاری ضمانت کرا دے۔'' وہ سوچنے لگی۔ پھر بیزاری سے اس نے اپنا پتہ بتا دیا، جسے انسپکٹر نے لکھ لیا پھر وہ بولا۔

''میں تمہارے ساتھ صرف اتنا کر سکتا ہوں بی بی کہ جب تک تم حوالات میں ہو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔ معاملہ اگر اتنے بڑے اور صاحبِ اختیار آدمی کا نہ ہوتا تو میں تمہیں چھوڑ بھی دیتا لیکن رب نواز صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''انسانوں جیسی باتیں کر کے انسانیت پر میرا اعتماد بحال کرنے کی کوشش نہ کریں انسپکٹر صاحب، جو آپ کی ضرورت ہو وہ کرتے رہیں۔ میں آپ کے کاموں میں مداخلت نہیں کروں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

رات گذر گئی۔ صبح کو ناشتہ دیا گیا جو شاید انسپکٹر کی مہربانی سے کچھ غنیمت تھا اور کسی قدر صاف ستھرے برتنوں میں تھا۔ اس نے ناشتہ کر لیا۔ نہ کرتی تو کیا کرتی۔ سخت بھوک لگی تھی۔ پھر پڑوس میں رہنے والے محمود ماموں آئے انہوں نے اس سے صورت حال معلوم کی سخت حیران تھے اور اسے دیکھ کر بھونچکے رہ گئے تھے۔ وہ پتھرائی ہوئی سی ان کے سامنے آ گئی۔

''بیٹا یہ سب کچھ کیا ہوا؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ محمود ماموں نے بہت سے سوالات کئے لیکن وہ خاموش رہی پھر انہوں نے کہا۔

''بیٹا دیکھو میں کسی وکیل سے بات کرتا ہوں۔''

''ماں جی کیسی ہیں؟''

''ظاہر ہے بیٹا وہ بیمار ہیں، تمہاری رات بھر گمشدگی سے ان کی حالت کافی خراب ہو گئی ہے۔''

محمود ماموں تین چار دن کے بعد محلے ایک اور بزرگ ریاض خاں کے ساتھ آئے۔ وکیل کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا کوئی نقد ضمانتی بھی نہیں مل سکا تھا۔ ہاں ایک خوشخبری اور سنا گئے تھے وہ دونوں۔ بیماری کی وجہ سے ماں جی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا

گیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ ماں جی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے لیکن وہ بے بس پنچھی تھی، جو کھو گیا تھا اسے نہیں پا سکتی تھی۔ دونوں نے اسے تسلیاں دیں اور پھر چلے گئے۔ گزرنے والی ہر گھڑی مایوسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اُسے کسی ہمدرد کا انتظار تھا بالکل ایسی فلمی کہانیوں کی طرح جن میں اس طرح کے ہمدرد اچانک سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ تڑپتے ہوئے آتے ہیں اور سامنے والے کی بے بسی پر رو پڑتے ہیں۔ وہ چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ یہ معصوم لڑکی چور نہیں ہے، اسے آزاد کرو۔ ورنہ...... ورنہ میں اس ناپاک معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ میں اس سماج کے در و دیوار ہلا دوں گا۔ کوئی اس کے سامنے نہ بول سکے۔ سب کو سانپ سونگھ جائے اور وہ پھر ان سلاخوں کے پیچھے سے نکل کر اپنی ماں جی کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن خوابوں کا یہ بے نقش انسان کوئی بھی نہیں تھا۔ خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کا راستہ تھا صرف، ایسا کوئی بھی نہیں تھا۔ خود کو فریب دینے سے کیا فائدہ۔ کوئی نہ آیا نہ محمود ماموں، نہ ریاض خاں اور نہ کوئی اور۔ شریف لوگوں کو یوں بھی تھانے آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ ماں جی کے بارے میں اس کے بعد کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ ہاں اتنا پتہ چل گیا تھا اسے کہ انہیں کسی خیراتی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ آخر کار چند روز کے بعد عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں اس پر الزامات لگانے والے بہت لوگ تھے۔ اس کی صفائی میں کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے چپ لگ گئی تھی، بہت سی باتیں اس سے پوچھی گئیں، اس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، مجسٹریٹ صاحب نے اس سے کہا کہ اگر وہ صفائی میں کچھ نہیں کہے گی تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن جو نقصان اسے ان چند دنوں میں پہنچ گیا تھا اس بڑا نقصان اور کیا ہو سکتا ہے وہ کیا کہتی۔ ویسے بھی وہ سن چکی تھی کہ رب نواز صاحب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور پھر اسے جیل بھیج دیا گیا۔

جیل تھانے کی نسبت دلچسپ جگہ تھی۔ یہاں بہت سے انوکھے کردار تھے۔ مائی ہدایتاں، جس نے اپنے آوارہ شوہر کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا۔ جمیلہ جس پر چوری کا الزام لگا تھا اور بھی کئی لڑکیاں اور عورتیں تھیں، جن کی الگ الگ کہانیاں تھیں۔ اس ماحول میں کس قدر اس کا دل بہل گیا۔ سماج اور

معاشرے کا شکار وہ تنہا نہیں تھی، سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا تھا۔ سب کے تجربات اسے تسلی دے رہے تھے۔ اس عورت کے آوارہ شوہر نے اس سے محبت کی تھی اور جب معاشرے سے لڑ کر اپنے لئے عدالت سے خودمختاری لے کر اس نے اپنے شوہر سے شادی کر لی تھی اور اس کی محبت میں اپنے بھرے پرے خاندان کو بھول گئی تھی تو اس کے شوہر نے اسے غلط راہوں پر چلانا چاہا۔ وہ خود تو نکما تھا لیکن اچھی زندگی کے خواب دیکھتا تھا اور اس کا ذریعہ اس نے اپنی خوبصورت بیوی کو بنانا چاہا تھا تو اس کی خوبصورت بیوی نے اس سے اپنی توہین کا انتقام لیا۔ اس نے اس لئے تو گھر نہیں چھوڑا تھا اس نے اپنے شوہر کو دھتورا کھلا دیا اور گرفتار ہوگئی۔ دوسری لڑکی کو بھی اس کے باپ نے چوری سکھائی تھی۔

ساری کہانیاں ایسی ہی تھیں، عدالت میں چند پیشیاں ہوئیں اور اس کے بعد اسے چھ ماہ کی سزا سنا دی گئی۔ ماحول بدل گیا۔ اب وہ ملزمہ کی جگہ مجرمہ بن گئی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد اپنے شوہر کو زہر کھلانے والی عورت بھی اس کے پاس آ گئی۔ اسے سات سال کی سزا ہوگئی۔

سزا ہونے کے تقریباً تین ماہ بعد کی بات ہے، ایک دن وہی انسپکٹر صاحب جیل آئے۔ جنہوں نے اسے گرفتار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا شاید اسے ہی تلاش کر رہے تھے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"کیسی ہو مرینہ؟"

"انسپکٹر صاحب آپ سب کی مہربانیوں سے کوئی تکلیف نہیں ہے بھلا اس جنت میں کیسی تکلیف ہو سکتی ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور انسپکٹر کی نگاہیں جھک گئیں۔

"تمہارے گھر سے کوئی آیا؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"میرا گھر میرے گھر میں کوئی ہوتا تو انسپکٹر صاحب تو میں بے گناہ جیل میں نہ ہوتی آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے تمہارا کوئی پڑوسی......"

"پڑوسی، ہمدرد، دوست دلچسپ الفاظ ہیں اور اس ماحول میں ہنس نہیں سکتی۔ انسپکٹر صاحب براہ کرم ہنسانے والی باتیں نہ کریں۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں معلوم ہوا؟"

"مم...... ماں ماں ماں جی۔" اس کی آواز رندھنے لگی۔

"ہسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا، کسی نے تھانے آ کر اطلاع دی تھی۔"

انسپکٹر نے افسردہ لہجے میں کہا اور اس کے دل میں ایک بار پھر گولہ سا اُٹھا۔ آواز بند ہوگئی پھر اس نے خود کو سنبھالا اور آنسو بھری آواز میں بولی۔

ماں جی نے تو ہمیشہ ہی مجھ پر احسانات کئے ہیں۔ یہ ان کا آخری احسان ہے میری زندگی پر۔ انہوں نے مجھے اس کشمکش سے نجات دلا دی کہ وہ کیسی ہوں گی۔ کیا کر رہی ہوں گی۔ میری دوست میری ہمدرد۔ مجھے سرزنش کرنے والی۔ میری محاسب وہی تو ایک تھیں اور میں سوچتی تھی کہ جب جیل سے نکلنے کے بعد میرا ان سے سامنا ہوگا تو میں کیا کہوں گی۔ ان سے کیسے انہیں یقین دلاؤں گی کہ میں بے گناہ تھی۔ وہ کہیں گی کہ اگر تم بے گناہ تھی تو تمہیں سزا کیوں ہوئی۔ کیا قانون اندھا ہے۔ کیا خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب وہ یہ باتیں کہیں گی تو میں انہیں کیا جواب دوں گی۔ میں آپ کی احسان مند ہوں ماں جی۔ میں آپ کی احسان مند ہوں۔ اس کی آواز چیخ بن گئی۔ ماں جی اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ ماں جی اب اللہ کے پاس جانے کے بعد تو آپ کو حقیقت کا پتہ چل گیا ہوگا۔ میں بے قصور ہوں۔ آپ کی قسم ماں جی میں بے قصور ہوں۔

اس کی حالت خراب ہوگئی اور وہ زاروقطار رونے لگی پھر وہ بے ہوش ہوگئی اور جب ہوش میں آئی تو اس کا سر اس کی ساتھی عورت کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی ہمدرد غمگسار اس جیسی اس کے دکھ میں شریک رہی اور جب تک وہ دکھی رہی وہ اس کے دکھ میں شریک رہی۔ آہستہ آہستہ وہ دکھ کو بھول گئی۔ وہی معمولات ہو گئے لیکن اس دن اسے سخت کوفت ہوئی جب اسے رہائی کی خبر سنائی گئی۔ جیلر نے اسے اپنے دفتر بلا کر اپنی دانست میں اسے خوشخبری سنائی تھی۔ لیکن وہ اس بری خبر کو سن کو پریشان ہوگئی۔ حیران

نگاہوں سے جیلر کو دیکھتی رہی اور جیلر نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں رہائی کی خوشی نہیں ہوئی؟" وہ چونک پڑی۔

"اب میں کیا کروں جناب؟"

"بس اپنے گھر جاؤ اور آئندہ ایک اچھی انسان کی زندگی گزارو۔ قدرت نے تمہیں ایک آزاد انسان کی طرح پیدا کیا ہے۔ قانون شکنی کر کے اس مختصر سی زندگی کو سلاخوں کے پیچھے گزارنے سے کیا فائدہ۔ جاؤ اپنا لباس وغیرہ لے لو۔"

اس کی ساتھی عورت اس سے سمٹ کر بلک بلک کر روئی تھی۔ وہ خود بھی سخت آزردہ تھی۔ جیل کے اس ماحول میں زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ بہت سی باتیں بھول گئی تھی۔ باہر کی زندگی میں پھر وہی سب کچھ موجود تھا، مسائل، الجھنیں، پریشانیاں اور وہ واحد ہمدرد ہستی تھی اب اس کا اس کائنات میں کوئی وجود نہیں تھا اب تو اس کا گھر خالی ہو گیا ہو گا۔ جیل کے بڑے پھاٹک سے باہر نکل آئی۔ کیسا عجیب عجیب شہر ہے۔ یہ سڑکیں کتنی عجیب ہیں۔ سب کچھ نیا نیا، اُداس اُداس جیسے پہلی بار اس شہر میں آئی ہو۔ چھ مہینے...... ان چھ مہینوں نے اسے کیا کیا دیا تھا، بہت سے تجربے کئے تھے اس نے ان چھ مہینوں میں خود پر۔ اور اب وہ پہلے جیسی جذباتی، بات بات پر رو پڑنے والی کمزور لڑکی نہیں رہی تھی۔ دل بڑا سخت ہو گیا تھا۔ پھر وہ ایک ویگن پر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ویگن نے اسے اس کے گھر کے سامنے اتار دیا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ماں کی موت کے بعد کسی نے اسے نہیں کھولا ہے۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اچانک ہی پڑوس کے دروازے میں سے کسی نے سر نکال کر جھانکا اور تھوڑی دیر کے بعد پورے محلے میں اس کی رہائی کی خبر ہو گئی۔ خالہ تالے کی چابی لے آئیں اور گھر کا دروازہ کھل گیا۔ وہ خالی گھر میں داخل ہو گئی اور اس کے پیچھے پڑوسنوں کا ہجوم اندر آ گیا۔ گھر کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، وہ لڑکیاں جنہیں ماں جی پڑھاتی تھیں، اکثر پورے گھر کی صفائی کرتی تھی لیکن ماں جی کے جانے کے بعد بند گھر کی صفائی کون کرتا۔ انہوں نے جلدی جلدی جھاڑوئیں منگوائیں اور جلدی جلدی صفائی میں مصروف ہو گئیں۔ وہ

خاموش نگاہوں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ چوری کی بات تو ان سب کو معلوم ہو ہی گئی لیکن ان میں سے کسی نے اس پر اُنگلیاں نہیں اُٹھائی تھیں۔ کوئی طعنہ زنی نہیں کی تھی۔ سرگوشیاں بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اشارے بھی نہیں کئے گئے تھے ایک دوسرے کو۔ اس کے برعکس وہ پہلے سے کہیں زیادہ خلوص اور محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ اسے ہاتھوں سے ہاتھ لیا تھا انہوں نے۔ ماں جی کی چارپائی خالی تھی۔ اس خالی چارپائی کو انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس پر بیٹھ گئی۔ خالہ اس کے پاس تھیں تب اس نے یہ سوال کر ڈالا۔

"آپ لوگ...... آپ لوگ بھی مجھے چور سمجھتے ہیں؟" بڑا درد تھا اس سوال میں۔ بڑی گھٹن تھی۔

"اللہ پاک کی قسم پورے محلے میں کسی کو بھی اس بات پر یقین نہیں ہے۔"

"ہم اندھے نہیں ہیں مرینہ بیٹی۔ آج سے نہیں جانتے تمہیں۔ جن لوگوں نے کسی پائی کا احسان قبول نہیں کیا ہو، جن کے دل اللہ نے اتنے بڑے بنائے ہوں وہ ایسے نہیں ہوتے۔ خدا غارت کرے انہیں جنہوں نے تم پر یہ الزام لگایا ہے۔ مظلوموں کا صبر پڑے ان پر۔ نادیہ کے ابا نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ تم پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ ہم سب کو یقین ہے کہ تم بے قصور تھیں۔ بے قصور ہو۔" سب کے جواب یکساں تھے اس کے دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی اور آنکھوں میں نمی آ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ اسے ماں جی کے حالات معلوم ہوئے جو بہت دلدوز تھے۔ اسے ان واقعات کا یقین تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی جدائی کے لمحات میں ماں جی بار بار مری ہوں گی۔ اس وقت تک انہیں سکون نہ ملا ہو گا جب تک موت نے ان کی مشکل حل نہ کی ہو گی۔ آہ اگر وہ اس حادثے کا شکار نہ ہوئی ہوتیں تو شاید ماں جی اس طرح نہ کھو جاتیں۔ پڑوس کے لوگوں کا رویہ ذرا بھی اس کے خلاف ہوتا تو شاید اس کی طبیعت کا وہ ٹھہراؤ قائم ہوتا جو اس نے چھ ماہ میں اپنے اندر پیدا کیا تھا۔ لیکن ہمدردانہ سلوک اور پیار بھری آوازوں نے اس کے زخم کھول دیئے اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آہ! ایسی گئی ماں جی کے پاس سے کہ انہیں پھر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اسے ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ آخری بار ماں جی نے اسے صبح

کی نماز کے لئے جگایا تھا۔ بس یہ ان سے آخری گفتگو تھی اور اس کے بعد جیل میں گزارے ہوئے وقت نے اسے بہت کچھ دیا تھا۔ رات بھر ماں کی خالی چارپائی اسے ڈستی رہی خالہ اس کے پاس ہی سوئی تھیں۔ پھر صبح ہی صبح اس کے لئے ناشتہ آ گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے اسے سنبھال لیا۔

اچھے پڑوسی بھی اللہ کا انعام ہوتے ہیں اگر یہ لوگ اسے اس قدر ہاتھوں ہاتھ نہ لیتے تو نجانے جیل سے رہائی کے بعد زندگی کیا بن جاتی لیکن سب نے اسے اپنے روّیے سے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ آج بھی ان کی نگاہوں میں قابل بھروسہ اور پاک صاف ہے اور جب دل کو ذرا سا قرار ملا، پڑوسیوں کی محبت نے زندگی پر اعتماد قائم کیا تو اس نے بھی اپنے بارے میں سوچا کہ اب مجھے ان لوگوں کے اعتماد کی لاج رکھنی ہے۔ رب نواز جیسے شخص کے خلاف بھلا وہ کیا کر سکتی تھی وہ کمزور اور بے بس تھی۔ ایک غریب محلے میں رہنے والی جہاں غربت ہر وقت خوفزدہ رہتی ہے۔ دن گزرنے لگے۔ تلخ حقیقتیں عیاں ہونے لگیں۔ زندگی سچ مچ ایک قید ہے۔ جس سے اپنی مرضی کی رہائی ممکن نہیں ہے جب تک سانس ہے جینا پڑتا ہے۔ ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ محبت کرنے والے پڑوسی اس کے بارے میں ہر طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کچھ حقیقت پسند تھے اور کچھ صرف محبتوں میں ڈوبے البتہ خالہ نے کہا۔

”بیٹی! اگر تمہاری والدہ زندہ ہوتیں تو تمہارے بارے میں صحیح انداز میں سوچتیں اب وہ نہیں ہیں تو میں تم سے کچھ بات کرنے پر مجبور ہوں کیا تم مجھے اجازت دو گی؟“

”کیا بات ہے خالہ جی بتایئے؟“

”لمبی زندگی ہے بیٹی ہم لوگ تمہارے لئے فکر مند ہیں۔ تمہارے خالو کہہ رہے تھے کہ تمہاری اجازت لے کر تمہارے لئے رشتہ تلاش کر لیا جائے۔ یوں اکیلی کب تک رہو گی زمانہ بہت خراب ہے۔“

”نہیں خالہ خدا کی قسم نہیں۔ یہ کبھی نہیں سوچیں میرے بارے میں۔ آپ میری ماں کی جگہ ہیں آپ جو بھی حکم دیں گی آپ کے قدموں میں سر جھکا دوں گی لیکن میری شادی کے بارے میں نہ سوچیں آپ، میں تنہا رہوں گی مگر آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ

تو میرے اتنے سارے ہیں مجھے تنہا کون کہہ سکتا ہے ہاں میں نوکری کروں گی خالہ جان! اگر کبھی میرے بزرگوں کو آپ کو میرے کردار میں کوئی کجی کوئی خرابی نظر آئے تو میں اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔“

”نہ نہ بیٹی نہ خدا نہ کرے۔ شریف خون کبھی خراب نہیں ہوتے۔ ہمیں یقین ہے لیکن بیٹی اس لمبی زندگی کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے دنیا کی نگاہیں بہت خراب ہوتی ہیں بیٹی اگر ہمیں اپنا سمجھتی ہو تو ہماری اس تشویش کو اپنے ذہن میں جگہ دو۔“

”خالہ جان نہیں خدا کے لئے ہمیں اس پر مجبور نہ کریں۔ میں نوکری کروں گی۔ ان بچیوں کو پڑھاؤں گی جنہیں ماں جی پڑھاتی تھیں اور بس۔ پر اگر خالہ جان آپ نے مجھے اس کے لئے مجبور کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔ اب میری زندگی کا یہی مقصد ہے اور کچھ نہیں۔“ اس نے اس طرح فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ خالہ کو خاموش ہونا پڑا۔ سوالات تو خود اس کے اپنے ذہن میں بھی بہت سے تھے۔ نوکری کی بات کر تو دی تھی لیکن یہ تصور معمولی نہیں تھا انتہائی روح فرسا تھا یہ تصور۔ لیکن اس سے مفر بھی تو ممکن نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ زندگی یہی ہوتی ہے تو یہی سہی۔ پھر کوئی رب نواز مل جائے، پھر جیل کی سزا کاٹ لی جائے گی کیا فرق پڑتا ہے۔ حالات ہمارے تابع تو نہیں ہوتے ہمیں حالات کے جھولے میں جھولنا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ قدم ملانا ہوتا ہے۔ گو وہ سارے قدم ہماری اپنی مرضی سے نہیں اٹھتے، لیکن اپنی مرضی سے تو ہم سانس تک نہیں لیتے۔ جبکہ بعض اوقات ہم سانس نہیں لینا چاہتے۔ بہرحال اس کے بعد اس نے پھر اخبارات دیکھنا شروع کر دیئے درخواستیں بھیجنا شروع کر دیں اور ایک دن اسے پھر ایک انٹرویو لیٹر مل گیا۔ بڑا خوفناک کام ہوتا ہے یہ۔ بہت سے خوف سے وابستہ ہوتے ہیں اس سے لیکن بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو خوفناک ہونے کے باوجود زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہیں، ان سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔

حسن علی پرائیویٹ لمیٹڈ کی عمارت اس شان و شوکت کی حامل نہیں تھی جس سے اس کی زندگی کے بدترین لمحات وابستہ رہے تھے۔ وہ ایک پرانی سی عمارت تھی اور اس

عمارت کے ایک حصے میں یہ دفتر واقع تھا جس میں کل تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ مہمانوں کے لئے ویٹنگ روم تھا۔ دوسرے میں دو کلرک بیٹھے ہوئے تھے اور تیسرا کمرہ باس کا تھا۔ ایک چپراسی نے اسے باس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ سیاہ رنگ کی میز کے پیچھے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ دبلے بدن کا مالک چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی تھی، آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا جو یقیناً نگاہ کا چشمہ تھا اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئی۔

''مرینہ ہے تمہارا نام؟''

''جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''پہلی بار ملازمت کے لئے نکلی ہو؟''

''جی نہیں۔''

''میرا مطلب ہے یہ تمہاری پہلی نوکری ہو گی یا اس سے قبل بھی نوکری کر چکی ہو۔؟''

''جی کر چکی ہوں۔'' اس کی مدھم آواز نکلی۔

''لیکن اپنی درخواست میں تم نے تجربہ کچھ لکھا نہیں؟''

''یہ نوکری میں نے صرف ایک ہفتے کی تھی جناب۔''

''کیوں چھوڑ دی؟'' اس نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی چند ساعت سوچتی رہی پھر بولی۔

''یہ بتانا ضروری ہے؟''

''ہاں میں جاننا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی خاص اعتراض نہ ہو تو بتا دو۔'' باس نے کہا اور وہ اسے گھورنے لگی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا۔

''اس لئے چھوڑ دی جناب کہ آپ جیسے ان داتا سمجھ بیٹھتے ہیں کہ غریب اور ضرورت مند انسان ان کے ہاتھوں میں کھلونا ہوتے ہیں۔ آپ اپنی بدکار جوانی میں نامعلوم کتنی لڑکیوں کو اپنی محبت کے جال میں پھانس کر شکار کرتے ہیں اور جب بوڑھے

ہو جاتے ہیں، جب آپ کے چہروں پر منحوس جھریاں پڑ جاتی ہیں اور کوئی ان پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا تو آپ نئے جال لاتے ہیں۔ بگلا بھگت بن کر اپنی دولت کے سہارے مجبوریاں خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کراہتے، سسکتے جسموں کو ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے لئے آپ سنہری سکوں کی کھنک سے کام لیتے ہیں۔ کڑکڑاتے نوٹ آپ کی باسی جوانی کو سنبھالتے ہیں۔ لیکن سب آپ کے شکار نہیں بن سکتے۔ میں آپ کی باغی ہوں۔ میں آپ کی اس دولت پر لعنت بھیجتی ہوں سمجھے آپ۔ میں نے اس لئے وہ نوکری چھوڑی تھی کہ میں ضرورت مند تھی۔ اس کتے سے میں نے ایڈوانس تنخواہ مانگی تھی، صرف اس لئے کہ ماں جی کو نمونیہ ہو گیا تھا اور ہم کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے قائل نہیں تھے۔ اس نے میری مجبوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی پھر جب میں نے اس کے ہوس بھرے شیطانی چہرے پر تھوک دیا تو اس نے مجھ پر چوری کا الزام لگوایا۔ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر مجھے سزا کرا دی اور اب میں یہ سزا کاٹ کر جیل سے آزاد ہوئی ہوں اور اس سزا کے دوران میں اس کائنات میں اپنی سب سے قیمتی شئے اپنی ماں جی کھو بیٹھی ہوں۔ میری ماں جی مر گئیں اور اب کوئی ایسی ضرورت میرے لئے باقی نہیں رہ گئی ہے جس کے لئے مجھے ایڈوانس مانگنا پڑے سمجھے آپ سمجھے۔ وہ شدت جذبات سے کانپ رہی تھی آنسوؤں کی دھار اس کے گالوں سے لڑھک کر قمیض بھگو رہی تھی اور سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی پتھرائی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر ایک عجیب سا تاثر جنم لے رہا تھا کچھ لمحات وہ خاموش رہا پھر بولا۔

''میں ایسا نہیں ہوں بیٹی۔ میرے لئے تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ بیٹی سارے انسان یکساں نہیں ہوتے تم نے سب کو اس جیسا کیوں سمجھ لیا؟''

''اس لئے جناب کہ دولت انسان سے اس کی انسانیت چھین لیتی ہے۔ سارے ہی دولت مند ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا اور کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔ آنسو تھے کہ روکے نہیں رک رہے تھے۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ تب دراز قامت بوڑھا اپنی جگہ سے، اٹھا اور میز کے پیچھے سے

نکل آیا۔اس نے مرینہ۔ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”خدا کا احسان ہے۔ کہ میں دولت مند نہیں ہوں بیٹی بس یہ چھوٹا سا کاروبار ہے جسے میں نے کسی اُمید پر جاری رکھا ہے ورنہ میری تنہا ذات کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میری آس نہیں ٹوٹی ہے۔ممکن ہے میری تقدیر کی صبح بھی ہو جائے۔ میں دولت مند نہیں ہوں بیٹی۔ اس کا اندازہ تم اس بوسیدہ سے دفتر سے لگا سکتی ہو۔ بیٹھ جاؤ بیٹی۔تم یہاں سے مایوس ہوکر واپس نہیں جاسکتیں۔ میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔اگر تمہارا باپ موجود ہے تو تم اس لفظ کے تقدس کو پرکھ سکتی ہو۔ خدانخواستہ اگر وہ نہیں ہیں تب بھی تمہارے ذہن میں باپ کی آواز تو ضرور ہوگی۔ میں اس آواز میں تمہیں پکار رہا ہوں مرینہ بیٹھ جاؤ۔“ ایسا سوز تھا اس آواز میں ایسا درد تھا کہ مرینہ کا درد آشنا دل لرز گیا۔ وہ تعجب سے دیکھنے لگی اور اس کے چہرے کی شکنوں میں اسے لاتعداد غموں کی داستانیں لکھی ہوئی محسوس ہوئیں اور نجانے کیوں ایک دم اس کے اندر سے ایک اعتماد ابھرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ سچ ہے۔چند لمحات کے لئے وہ اپنا غم بھول گئی اور پھر آہستہ آہستہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوڑھے باس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلوایا اور چائے طلب کر لی پھر وہ بولا۔

”آنسو خشک کر لو بیٹی۔ مجھے اس بھیڑیے کے بارے میں بتاؤ کون تھا وہ جس نے دنیا سے تمہارا اعتبار اُٹھا دیا وہ کون ظالم تھا جس نے اس چھوٹی سی عمر میں تمہیں اتنے سارے غم دے دیئے؟“

اس کی فرم کا نام آرگس امپوریو تھا اور وہ بھیڑیا اس فرم کا مالک رب نواز تھا۔“

”رب نواز......“ اس کی آواز میں غراہٹ ابھر آئی اور اس نے خونخوار نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے کو دیکھا لیکن بوڑھے کی کیفیت دیکھ کر اسے خود پر قابو پانا پڑا۔ بوڑھے کی حالت اچانک غیر ہونے لگی تھی۔اس کے بدن میں تشنج پیدا ہوگیا تھا اور چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ شدید اعصابی ہیجان کا شکار نظر آ رہا تھا۔پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے میز کی دراز کھولی اور اس سے ایک سگار نکال کر اس کا سرا توڑا اور اسے دانتوں میں دبا لیا پھر لرزتے ہاتھوں سے اس نے سگار جلایا اور اس کے لمبے لمبے کش

لینے لگا۔ کچھ لمحے وہ اسی ہیجان کا شکار رہا پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہوگیا۔البتہ اس کے منہ سے ایک غراہٹ سی ابھری۔

”رب......نواز...... ہاں......رب......نواز......“

”آپ......آپ اسے جانتے ہیں۔“

بوڑھے نے سگار کے مزید کش لئے اور پھر آہستہ سے بولا۔

”ہاں جانتا ہوں میرا اسے گہرا رشتہ ہے بہت گہرا رشتہ ہے اس سے میرا۔“

مرینہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

کسی بھی رشتے کا ذکر اس انداز میں نہیں کیا جاتا جس انداز میں بوڑھے شخص نے اپنے اس رشتے کی بات کی تھی۔ مرینہ بدستور حیران نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ بوڑھے کے آگے بولنے کا انتظار کر رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''سر معافی چاہتی ہوں آپ کی کیفیت بہت عجیب ہوگئی ہے۔ آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے کیا آپ......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ہاں میرا اس سے رشتہ ہے۔ میرا اس سے نفرت کا رشتہ ہے۔ انتقام کا رشتہ ہے۔ رب نواز وہ ظالم درندہ بہت سے دشمنوں کے درمیان رہتا ہے، لیکن ابھی تک قدرت نے اس کی رسی دراز رکھی ہے اور اسے ابھی تک سزا نہیں ملی۔ یہ کیسا نظام قدرت ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ آج بھی زندہ ہے وہ آج بھی انسانوں سے کھیل رہا ہے نجانے اور کتنے شکار کیے ہوں گے اس نے۔ نجانے اور کتنی کہانیاں تخلیق کی ہوں گی اس نے اپنے مظالم کی۔ میں بھی اس کا شکار ہوں بیٹی۔ میرے سینے میں بھی اس نے ایک ناسور ڈال دیا ہے۔ میرے رگ وپے میں اس انتقام کی خواہش خون بن کر دوڑتی ہے۔ کاش میں اس سے انتقام لے سکتا۔ کاش......'' بوڑھا جلدی جلدی سگار کے کش لینے لگا۔ وہ شدید اعصابی ہیجان کا شکار لگ رہا تھا اور مرینہ بڑی عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت چپراسی نے چائے لاکر رکھ دی اور پیالیاں سنبھال کر چائے بنانے لگا تو مرینہ نے کہا۔

''نہیں تم جاؤ میں چائے بناؤں گی۔'' چپراسی گردن خم کر کے چلا گیا تو مرینہ نے چائے کی ٹرے اپنی طرف کھسکائی اور چائے بنانے لگی۔ بوڑھے شخص کو چائے پیش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں ضرورت سے زیادہ جرأت کر رہی ہوں۔ جناب ملازمت کی تلاش میں آئی تھی لیکن اپنی حد تجاوز کر رہی ہوں۔ آپ مجھے ملازمت دیں یا نہ دیں، لیکن آپ کے الفاظ نے میرے ذہن میں ایک تجسس بیدار کر دیا ہے۔ شاید آپ کا جذبہ مجھ سے بھی شدید ہے۔ میں نے تو اس کی وجہ سے اپنی ماں کو بے بسی سے کھو دیا ہے۔ پتہ نہیں اس کمبخت نے آپ سے کیا چھینا ہے۔ یہ بات میرے لئے حیرانی کا باعث ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں آپ کو اس مردود سے کیا تکلیف پہنچی ہے یہ جاننے کی خواہش میرے دل میں بہت دور تک اتر گئی ہے۔''

''میں تمہیں خود بتانے کا خواہش مند ہوں بیٹی۔ میرے تم سے دو رشتے قائم ہو گئے ہیں۔ سمجھیں دو رشتے۔ میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ میری بات پر یقین کر لو کہ تم سے پہلے میں نے یہ لفظ کسی اجنبی لڑکی سے نہیں کہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی ظالم کے شکار ہیں۔ میں اس کمینہ صفت رب نواز کو اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ اس کی وجہ سے میری مکمل زندگی تباہ ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے میرا بہت کچھ کھو گیا ہے۔'' بزرگ نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا شاید وہ ماضی کی یادوں کو تازہ کر رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''یہ فرم میرے نام ہے اور میرے سٹاف نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں اس فرم کا مالک ہوں۔ میرا نام حسن علی بیگ ہے۔ بیس یا بائیس سال یا شاید اس سے کچھ زیادہ گزر گئے ہیں۔ میں اور رب نواز ایک ہی فرم میں نوکری کرتے تھے وہ اکاؤنٹنٹ اور میں اسسٹنٹ منیجر چھوٹی سی فرم تھی۔ چند افراد پر مشتمل۔ بہت گہری دوستی تھی میرے اور رب نواز کے درمیان۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کی بیوی بھی ایک انتہائی خوش اخلاق اور نیک عورت تھی۔ ایک بیٹا تھا اس کا۔ ادھر میں بھی شادی شدہ تھا اور میری بھی ایک بچی تھی۔ اس وقت میری بچی کی عمر صرف چند ماہ تھی۔ ہم دونوں اکثر اپنے مستقبل سے پریشان رہتے تھے۔ ہمیں اپنے بچوں کی فکر تھی۔ کرائے کا گھر بس درمیانہ سی تنخواہ۔ کوئی مستقبل نہیں تھا ہمارا۔ میں اور رب نواز گھنٹوں سر جوڑے بیٹھے رہتے تھے اور سوچتے تھے کہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بہت

سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے ایک تجویز پیش کی اس نے کہا کہ اگر ہم اس ملک میں رہے تو یونہی سسک سسک کر مر جائیں گے اور ہماری اولادیں کسمپرسی کی زندگی گزاریں گی اس لئے کیوں نہ ملک سے باہر نکلا جائے اور باہر جا کر دنیا میں قسمت آزمائی کی جائے۔ رب نواز کی اس معصومانہ بات پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''میرے محبوب دوست کیا ملک سے باہر جانا آسان کام ہوگا۔ تم نے اخبارات میں اکثر پڑھا ہوگا ہمارے جیسے لوگ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا جب ملک سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی لاشیں ہی واپس آتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہیں چلتا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ہم اس طرح نہیں جائیں گے۔''

''کیا مطلب پھر باہر جانے کے لئے جو رقم درکار ہوتی ہے اس کا کیا بندوبست ہوگا اور پھر ہم اپنے بچوں کو اس طرح چھوڑ کر جائیں گے تو ان کے لئے کیا بندوبست کیا جائے گا؟''

''میں سارے انتظامات کر لوں گا۔ رقم کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔'' رب نواز نے کہا اور میں حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگا لیکن اس کے چہرے پر بڑا عزم تھا۔

''اور بچے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم یوں کرو اپنی بیگم سے بات کرو۔ انہیں کچھ عرصے کے لئے ان کی بہن کے ہاں بھیج دو اور اتنا خرچ دے جاؤ کہ وہ چند ماہ آسانی سے گزار لیں۔'' رب نواز نے کہا۔

''مگر یار کمال کی باتیں کرتے ہو آخر یہ سب ہوگا کہاں سے؟''

''بات اصل میں یہ ہے دوست۔ میری بات غور سے سنو اگر ہم اسی طرح زندگی گزارتے رہے تو بہت جلد بوڑھے ہو کر مر جائیں گے۔ موت تو ویسے ہی ہمارا مقدر ہے۔ پھر کیوں نہ زندگی کے لئے ہمت کریں۔ رقم کا بندوبست میرے اوپر چھوڑ دو اور دوسری تیاریاں کر لو۔ ہم جو کچھ کریں گے اپنے بچوں کے لئے کریں گے۔ اپنی اور ان کی بہتر زندگی کے لئے کریں گے تم بس میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاؤ۔''

میں یقین نہ کرنے والے انداز میں اسے دیکھتا رہا لیکن اس نے کچھ ایسی یقین دہانیاں کیں کہ آخر کار میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو آمادہ کر کے اس کی بہن کے ہاں بھیج دیا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ اس نے طے کیا تھا کہ یونان کے جہاز سے اسمگل ہو کر ہم دونوں باہر جائیں گے۔ اس کا بندوبست وہ شاید کرنے لگا تھا بہرحال سارے غیر قانونی کام تھے۔ لیکن کیا کیا جاتا کچھ اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے تھے اس نے کہ میں مکمل طور پر اس کے جال میں آ گیا۔ ہمارے درمیان یہ بات طے ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا علم کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے اور پھر ایک شام اس نے مجھے ایک بڑی رقم دے کر کہا کہ یہ میں اپنی بیوی کو بھجوا دوں اور اس سے کہہ دوں کہ وہ آرام سے وقت گزارے میں زندگی کی جدوجہد کر رہا ہوں ہمیں رات ہی جو جہاز پر پہنچنا ہے کیونکہ جس جہاز سے ملک سے باہر جانے کا انتظام کیا گیا ہے وہ صبح چار بجے ساحل چھوڑ دے گا۔ بہرحال وہ مجھ سے زیادہ ذہین تھا۔ تم مجھے دیکھ رہی ہو یہ بات میں کہنا نہیں چاہتا میری عمر اتنی نہیں ہے جتنا میں نظر آ رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ مصائب نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے ورنہ میری عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ خیر تو رب نواز نے وہ رقم دے کر مجھ سے تمام پروگرام طے کر لئے جو چکر اس نے چلایا تھا وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ بہرحال میں نے رقم اپنی بیگم کو بھجوا دی اور پھر اسی رات ہم دونوں نے ملک چھوڑ دیا۔ بندرگاہ سے جہاز تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹی سی لانچ ہمیں لے کر چل پڑی اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس یونانی جہاز پر پہنچ گئے۔ یونانی جہاز نے رات کو ساحل چھوڑ دیا اور ہمارے سفر کا آغاز ہو گیا۔ یہ سفر کافی طویل تھا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں ایک یورپی ملک میں چھوڑ دیا۔ یہاں ہم چوروں جیسی زندگی گزارنے لگے۔ بڑی سخت مشکلات سے زندگی بسر کرنا پڑی تھی۔ تقریباً چھ ماہ ہم نے فاقہ کشی میں گزارے۔ میں اُکتا رہا تھا اور میری اس سے اکثر جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اس سے سخت لہجے میں کہا کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ میں ہر قیمت پر واپس اپنے ملک جاؤں گا۔ میں بیوی بچوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ میری اس ضد کے جواب میں اس نے کہا کہ اگر اپنے ملک گئے

گرفتار ہو جائیں گے۔

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ میرے دوست کہ ہم غیر قانونی طور پر ملک سے باہر آئے ہیں یعنی سمگل ہو کر بالفرض محال اس مرحلے سے گزر بھی گئے تو تمہیں وہ رقم تو یاد ہو گی جو ہمارے یہاں آنے کا ذریعہ بنی تھی۔''

''رقم...... ہاں یاد ہے۔''

''نہیں تمہیں نہیں یاد ہو گی میں تمہیں بیس لاکھ روپے یاد دلاتا ہوں جو تم نے نیوایج آرگنائزیشن کے حساب میں حاصل کر کے مجھے جمع کرانے کے لئے دیئے تھے۔''

مجھے وہ رقم یاد آ گئی جو ایک فرم نے میری فرم کو نقد ادا کی تھی۔ نجانے کیوں میرے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ میں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''ہاں یاد ہے۔''

''اس رقم کا اسٹیٹمنٹ تو بن گیا تھا لیکن کسی پاس بک میں اس کے بینک میں جمع ہونے کی رسید نہیں ہے۔ وہی رقم تو ہمارے کام آئی تھی۔ میرے دوست پانچ لاکھ روپے جہاز کے کپتان کو دینے پڑے تھے۔ پچاس ہزار روپے تم نے اپنے گھر بھجوائے تھے اور پچاس ہزار روپے میں نے اپنی بیوی کو دیئے تھے۔ باقی رقم آج تک ہماری معاون رہی ہے۔ میں نے اس میں سے کچھ رقم بینکوں میں جمع کرا دی تھی اور کچھ کے چیک بنوا لئے تھے۔'' اس نے انکشاف کیا اور میرے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔

وہ مزید بولا ''اور آج تک ہمارے وطن کی پولیس بیس لاکھ روپے کے غبن کے ان دونوں مجرموں کو یعنی مجھے اور تمہیں تلاش کرتی رہی ہے۔''

میں نے خفیہ ذرائع سے کچھ لوگوں سے معلومات حاصل کی تھیں اپنے بارے میں۔ میں پسینہ پسینہ ہو گیا اپنے ملک میں میں ایک مجرم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس جرم میں ہم دونوں شریک تھے۔ میں شدید بدحواسی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا تو وہ مجھے سمجھانے لگا۔

''مجھے بتاؤ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار تھا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے اور تمہارے مستقبل کے لئے کیا ہے۔ لگے رہو۔ اگر دولت حاصل ہو گئی تو اپنے ملک چلیں گے۔ اس وقت تک ہمارے کیس کی فائل بند ہو چکی ہو گی۔ اور نہ بھی بند ہوئی تو دولت سے کیا نہیں ہو سکتا۔'' وہ مجھے سمجھاتا رہا اور میں نے محسوس کیا کہ میں بہت بڑی مجبوری کا شکار ہو گیا ہوں۔ بہر حال ہم یورپ کے مختلف ملکوں میں آوارہ گردی کرتے رہے اور پھر تقدیر کا ستارہ گردش سے نکل آیا۔ مجھے ایک نوکری مل گئی جو ایک شپنگ کمپنی کی تھی۔ رب نواز ہوٹل کا منیجر بن گیا اور ہمارے حالات بہتر سے بہتر ہونے لگے۔ ایک سال کے بعد ہم نے بڑے خفیہ طریقے سے اپنے گھروں کو رقم بھیجی۔ شپنگ کمپنی نے میری کارکردگی سے متاثر ہو کر مجھے کچھ اور ذمے داریاں سونپ دیں اور مجھے کئی ملکوں میں جانے کا موقع مل گیا۔ اس طرح میری آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے کچھ اور بھی ہاتھ پاؤں مارے تھے جو ناجائز نہیں تھے لیکن مجھے ان سے خوب آمدنی ہونے لگی۔ اس کے برعکس رب نواز کا گزارہ اس کی تنخواہ پر ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ اور بری عادتیں ڈال لی تھیں اور اس طرح وہ اپنی ساری آمدنی وہیں خرچ کر لیتا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی کا خط میرے ہاتھ لگ گیا جس میں اس نے اپنی کسمپرسی اور بے بسی کا رونا رویا تھا۔ میں نے رب نواز کو برا بھلا کہا اور ایک بڑی رقم اس کی بیوی کو روانہ کر دی جس پر وہ میرا بہت شکر گزار ہوا تھا۔ میری آمدنی کافی بڑھ چکی تھی لیکن رب نواز کی وہی کیفیت تھی۔ ہوٹل کی نوکری سے بھی وہ بہت غیر ذمہ داری برت رہا تھا جس کی وجہ سے اسے بالآخر ملازمت سے جواب مل گیا۔ میں اس کی حالت بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور قدرت نے مجھے خوب نوازا تھا۔ اس طرح ہم دونوں وقت گزارتے رہے۔ میں اپنی بیوی کو رقومات بھیج رہا تھا اور چونکہ ہم اصل حیثیت سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اس کا ذریعہ بھی رب نواز ہی نے نکالا تھا اور وہی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے رقومات کو ہمارے وطن منتقل کر رہا تھا۔ میری سادگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور میں اپنے دوست پر بھروسہ کرتا تھا۔ بہرطور اسی دوران وہ بیمار ہو گیا اور جب اس کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو مجھے تشویش ہو گئی۔ ہم لوگ

بہر حال ایک دوسرے کے دوست تھے اور میں اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ اگر رب نواز مجھے یہاں لانے کا ذریعہ نہ بنتا تو میں کبھی اس قابل نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے اسے وطن واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اس سے مشورہ کیا تو وہ بولا کہ اس کے دل میں خود یہ آرزو ہے کہ وہ وطن واپس چلا جائے لیکن اس نے کہا ہم دونوں کا ایک ساتھ وطن واپس جانا مناسب نہیں ہوگا اب تک وہ جن ذرائع سے رقم بھیجتا رہا ہے انہیں بھی نہیں معلوم کہ ہم کون لوگ ہیں اور کس طرح اپنے وطن سے یہاں آئے ہیں۔ رب نواز نے مجھے کچھ ایسی پٹیاں پڑھائیں تھیں کہ میں پھر اس کے پھیر میں آ گیا۔ اس نے کہا اگر وطن واپس پہنچنے کے بعد حالت بہتر ہوگئی تو وہ وہاں پر اس طرح کے انتظامات کرے گا کہ میں اس کے بعد میری واپسی بھی ممکن ہو جائے۔

وہ وطن واپس آ گیا۔ یہاں ہمارے بیوی بچے سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس نے اپنا علاج کرایا اور تندرست ہو گیا۔ وہ مجھے یہاں کے حالات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے اس کمپنی کے بارے میں بتایا جس سے فراڈ کر کے ہم لوگ ملک سے باہر بھاگے تھے۔ کمپنی کی طرف ہماری فائلیں اب تک کھلی ہوئی تھیں۔ پولیس نے ہمارا کیس بند نہیں کیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ ہے اور میں اپنی بیٹی کی صورت تک نہیں دیکھ سکتا۔ اس دوران ہمارے درمیان یہ گفتگو بھی ہوئی تھی کہ کیوں نہ ہم اپنے بچوں کو یہاں بلوائیں کیونکہ یہ خدشہ تھا کہ پولیس نے اس کی نگرانی نہیں چھوڑی ہوگی۔ وہ ان کا پیچھا کرتی ہوئی ہم تک نہ پہنچ جائے۔ میں خاموش ہو گیا تھا۔ کچھ وقت اور گزر گیا پر رب نواز نے مجھے بتایا کہ اسے کچھ لوگ ملے ہیں جن کے ذریعہ وہ اس کمپنی سے رابطہ کرسکتا ہے، جس کی رقم ہم نے غبن کی تھی۔ رقم کچھ زیادہ دینی پڑے گی اس کے علاوہ پولیس کو بھی کچھ کھلانا پڑے گا جن کے غرض سے کیس ختم ہو سکتے ہیں اور ہم دونوں منظر عام پر آ سکتے ہیں۔ پر میری وطن واپسی مشکل نہیں ہوتی۔ لیکن رقم بہت زیادہ خرچ ہو جائے گی۔

میں نے آمادگی ظاہر کر دی کیونکہ اس دوران میری پاس بہت رقم جمع ہو چکی تھی۔ رب نواز جوڑ توڑ کرنے لگا۔ میں اسے بڑی بڑی رقمیں بھیجنے لگا۔ پھر اس نے مجھے بتایا

کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب ہمارے لئے وطن میں کوئی خطرہ نہیں رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کچھ اور کاروائی بھی کی ہے وہ یہ کہ اس نے ایک فرم رجسٹر کرائی ہے جس کے تحت میں بیرون ملک کے اپنے اثاثے وطن منتقل کر سکتا ہوں چنانچہ میں اس کا آغاز کر دوں۔ میں سادہ لوح تھا۔ میں نے اپنی دولت آرگس امپوریو کے نام منتقل کرتا رہا۔ بعد میں کام سے فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد میں وطن واپس چل پڑا۔ میں نے اپنی بیوی کو وطن واپسی کی اطلاع بھی دی تھی کیونکہ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ائیرپورٹ پر رب نواز نے میرا استقبال کیا۔ اس کی تو شخصیت بھی بدل چکی تھی۔ اپنی عمر سے کافی چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بھی منع کر دیا تھا کہ میری بیوی کو دستی خبر نہ کرے میں اسے اچانک ملوں گا۔ رب نواز نے مجھے ایک عمارت میں بلایا۔ میں اس عمارت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس خالی عمارت میں آ کر اچانک اس نے رویہ بدل دیا اور بولا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ دنیا نے مجھے بڑے تلخ تجربات سے دوچار کیا ہے۔ اس دور میں کامیاب شخص وہی ہے جو مکمل طور پر غیر جذباتی ہو۔ انسان جذبات کے ہاتھوں کھلونا بن کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ میں تم سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

مجھے اس کا انداز بدلا ہوا محسوس ہوا تھا پھر یہ خالی عمارت بھی عجیب سا احساس دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے رب نواز تم کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہو کیا بات ہے؟"
"تمہیں کچھ معاملات میں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔"
"مثلاً؟"

"یہ کچھ کاغذات ہیں ان پر دستخط کر دو۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ آرگس امپوریو میرے نام رجسٹرڈ ہے اور میں بلاشریک غیرے اس کا مالک ہوں۔ تم نے جو رقومات اس فرم کے نام منتقل کی ہیں ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کاغذات تمہیں تمہارے اثاثوں سے بے دخل کرتے ہیں۔ اگر تم میری تمام ہدایات پر

عمل کر دو تو میں تمہیں خاموشی سے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت دے دوں گا ورنہ دوسری صورت میں تم اپنی کمپنی میں غبن کرنے کی حیثیت سے گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ وقت جانتا ہے۔''

میں حواس باختہ ہو گیا تھا۔ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اور جو تم نے کہا تھا کہ تم نے کمپنی کی رقم واپس کر کے اور پولیس کو رقم کھلا کر معاملہ ہموار کر لیا ہے۔''

''کمپنی سے تو نہیں، پولیس سے معاملہ ضرور ہموار کر لیا ہے۔ ایک کہانی ترتیب دے کر میں نے پولیس سے وعدہ کیا ہے کہ میں غبن کے مجرم کو ان کے حوالے ضرور کروں گا۔ اگر تم نے میری بات مان لی تو میں تمہیں زندگی گزارنے کے لیے تھوڑی بہت رقم بھی دے دوں گا۔ اس کے بعد تم کسی گمنام جگہ ساری زندگی بسر کر سکو گے۔''

''مجھے وقت دو میں سوچنا چاہتا ہوں۔''

''بیکار ہے۔ تمہارے پاس نجات کا صرف ایک راستہ ہے جو میں نے منتخب کیا ہے۔''

''پھر بھی۔ مجھے سوچنے تو دو۔'' میں نے کہا اور وہ تیار ہو گیا۔ وہ چلا گیا اور میں سکتے کے عالم میں سوچتا رہ گیا۔ کیا واقعی ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا دوستی اتنی ناپائیدار چیز ہے۔ میرے ہوش گم تھے۔ میرے دوست نے میرے ساتھ یہ کیا کیا تھا۔ وہ جس کے بارے میں، میں نے ہمیشہ اچھے انداز میں سوچا تھا۔

پھر مجھے اس کمرے میں قید کر دیا تھا۔ باہر شاید کچھ لوگوں کو پہرے پر بھی رکھا گیا تھا۔ جس شخص نے مجھے چائے کھانا اور ناشتہ دیا تھا وہ شکل سے جرائم پیشہ معلوم ہوتا تھا۔ دو آدمی تھے جو میرے کمرے کے دروازہ کے باہر ہی ہوتے تھے کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

رب نواز جانتا تھا کہ میں امن پسند ہوں کسی پر تشدد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس بھول میں وہ اطمینان سے دوبارہ میرے پاس آ گیا تھا۔ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس نے پھر وہی مطالبہ کیا۔

''سنو جو کچھ تم چاہتے ہو وہ میں کر دوں گا لیکن پہلے مجھے اپنی بیوی اور بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

صرف وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں اپنی کوئی شرط مت لگاؤ۔ اس نے غرا کر کہا۔

اور میں نے پیتل کا وہ گلدان اس کے سر پر دے مارا جسے میں نے ہتھیار کے طور پر پہلے ہی تیار رکھا تھا۔ وار کاری نہیں تھا ورنہ پہلی ہی کوشش میں اس کا بھیجا باہر نکل پڑتا۔ مگر اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے دو اور وار اس پر کیے۔ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔ مگر اس کی چیخیں سن کر اس کے آدمی اندر آ گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔

وہ شدید زخمی ہو گیا تھا بس تقدیر تھی کہ وہ زندہ بچ گیا۔ لیکن مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ میں بے یار و مددگار تھا اور وہ ہر طرح سے صاحبِ اختیار۔ اس کے پاس شاندار وکیل تھے اور میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ صاحبِ زر کی کس طرح سنی جاتی ہے اس کا خوب تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ تین ماہ ہسپتال میں رہا اور میں پولیس لاک اپ میں۔ اس کے وکیلوں نے مجھے بدترین جرائم پیشہ شخص قرار دیا تھا جو غبن اور قاتلانہ حملے کا مجرم تھا۔ اس کی دولت کام کر رہی تھی۔ آخر کار مجھے میرے جرائم کی بنیاد پر اور اس کی شاندار کوششوں سے لمبی سزا ہو گئی اور میں جیل میں پہنچ گیا۔

بس اس کے بعد صرف سوچیں تھیں، سزا تھی جو کاٹنا تھی۔ پھر سزا ختم ہو گئی لیکن صرف جیل کی سزا، زندگی کی سزا باقی تھی۔ میں جیل سے باہر نکل آیا۔ بہت دن تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اب کیا کروں۔ بیوی اور بیٹی کو تلاش کیا۔ وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس تھیں۔ لیکن اب وہاں ایک شاندار پلازہ بنا ہوا تھا۔ جن لوگوں سے یہ زمین حاصل کی گئی تھی وہ کبھی کے مرکھپ گئے تھے۔ کسی کا کوئی پتہ نہ نہیں چل سکا۔ جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا جدوجہد کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ دینا سے جنگ کی ہمت نہیں رہی تھی، تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ لیکن اس لگن، اس آرزو کو نہیں مار سکا کہ مجھے میری بیوی، میری بیٹی مل جائے اور آج تک اسی خیال سے جی رہا ہوں کہ شاید شاید کبھی اچانک کبھی اچانک......!

اس کی سسکیاں اُبھرنے لگیں۔ مرینہ کا دل پگھل رہا تھا۔ ایک بار اس نے سوچا

کہ بوڑھے کو تسلی دے لیکن ایسا نہ کرسکی۔ کچھ دیر بعد بوڑھے حسن علی نے کہا۔

''میری ضرورتیں کچھ نہیں ہیں۔ بس اسی احساس نے مجھے دوبارہ زندگی کی طرف لوٹا دیا ہے کہ اگر کبھی میری گمشدہ جنت مجھے مل گئی تو میں اسے کیا دوں گا۔ یہ چھوٹی سی فرم میں نے اسی خیال کے تحت بنائی ہے۔''

''بہت دُکھ بھری داستان ہے آپ کی سر، کاش آپ کی یہ آرزو پوری ہو جائے۔''

''بہت عرصہ کے بعد اس مردود کا نام سامنے آیا تو سارے زخم تازہ ہو گئے۔ وہ بے غیرت اسی طرح کا انسان تھا۔ دیارِ غیر میں بھی اس نے ہزاروں برائیاں کی تھیں اور اب تو اس کی بیوی بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔

''نہیں ہے؟''

''ہاں۔ کسی کار ایکسیڈنٹ میں وہ ہلاک ہوگئی تھی۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''جیل سے رہا ہونے کے بعد اور اپنی بیوی اور بیٹی کی تلاش کے دوران میں نے اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل کی ہیں۔ اس نے خود کو بہت مضبوط کرلیا ہے۔''

''اسے آپ کی رہائی کی خبر ہے؟''

''شاید نہیں۔''

''آپ کی اس فرم کا پتہ بھی نہیں ہے؟''

''یہ فرم میں نے اصل نام سے نہیں بنائی۔ میں نے اپنا اصل نام چھپا رکھا ہے۔''

''تو حسن علی آپ کا اصل نام نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ لیکن مرینہ نے اس کا اصل نام نہیں پوچھا، آخر وہ چاہتا تو خود بتا سکتا تھا۔ البتہ اس نے اس سے ایک سوال ضرور کیا۔

''سر کیا آپ نے اُسے معاف کر دیا؟''

''کیا..... تم نے اُسے معاف کر دیا۔'' اس نے اُلٹا سوال کیا۔

مرینہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے بدن پر شدتِ جوش سے کپکپی طاری ہو گئی

تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''اس نے مجھ سے میری ماں چھین لی، میری زندگی کے قیمتی لمحے چھین لیے، کیا میں اسے معاف کرسکتی ہوں۔ لیکن سر، اس معاشرے میں مجھ جیسی بے شمار لڑکیاں بے بسی سے جی رہی ہیں۔ وہ ایسے بھیڑیوں کے خلاف کیا کرسکتی ہیں سر میں نے اسے معاف نہیں کیا لیکن میرے پاس وسائل نہیں ہیں۔''

''اُس نے مجھ سے میری دولت چھین لی، میری بیوی، میری بیٹی چھین لی۔ میرے جوانی کے خوبصورت سال چھین لیے۔ بھلا میں اسے معاف کرسکتا ہوں۔ بس وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انہی دو آرزوؤں کے ساتھ کہ کاش کبھی وقت میرے بھی حق میں ہو۔''

''کاش.....'' مرینہ کے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ پھر وہ چونک کر بولی۔

''سر..... کافی وقت لے لیا میں نے آپ کا۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' حسن علی نے کہا۔

''جی سر.....''

''میں تمہارے ساتھ مل کر اس مردود سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ بولو میرے ساتھ اشتراک کرو گی؟''

''خدا کی قسم سر۔ میں تو اسے تائید غیبی سمجھتی ہوں۔ مجھے نوکری کی اتنی ضرورت نہیں تھی، بس زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لیے اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے یہ سوچا تھا۔

''میں نے پورے خلوص سے تمہیں بیٹی کہا تھا۔ میرا ہر جذبہ شاید بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گیا۔ ہم دونوں مل کر اس بدکردار شخص کو سزا دیں گے۔ آہ..... وہ موذی تو تھا پر اتنا بگڑ جائے گا اس کی اُمید نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی مجبور بچیوں کو اس نے نقصان پہنچایا ہو گا۔ اب تو یہ ایک نیک کام بھی ہو گا۔''

''لیکن اس کے وسائل..... کیا ہم اسے آسانی سے کوئی نقصان پہنچا سکیں گے؟''

''پہلے میں اکیلا تھا لیکن اب..... میرے جیسے جذبے سے مالا مال تم بھی میرے

ساتھ ہو۔ وہ ہم دونوں کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ میں بتاؤں گا ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"اس لیے نہیں سر کہ آپ مجھے نوکری دیں گے، بلکہ اس لیے کہ ہماری منزل ایک ہے۔ میں آپ کی ہر ہدایت پر عمل کرنے کے لیے خلوصِ دل سے تیار ہوں۔ لیکن ایک شکایت کرنا چاہتی ہوں۔"

"شکایت...... چلو بھئی کر لو اور ہم اس کے لیے پہلے سے تم سے معافی مانگنے کو تیار ہیں۔"

"مجھے آپ کا نام ابھی تک نہیں معلوم۔ جبکہ آپ نے ابھی خود بتایا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جس کا بورڈ باہر لگا ہوا ہے۔"

"میرا نام مرزا جمال بیگ ہے۔"

"جی" اس نے کہا۔ پھر بولی۔

"مجھے اجازت ملے گی؟"

"ہاں...... ویسے کیا تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہوئی کہ تمہارے علاوہ یہاں کوئی لڑکی ملازمت کے لیے نہیں آئی جبکہ میں نے انٹرویو کا وقت دیا تھا۔"

"ارے ہاں۔ حیرت کی بات تو ہے۔"

"نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ عمارت اور اس میں میرا دفتر تم نے دیکھ لیا۔ بہت معمولی سی جگہ ہے۔ اگر کوئی آئی بھی ہوگی تو اس کا حلیہ دیکھ کر چلی گئی ہوگی۔ چلو خیر کل تم کس وقت آؤ گی؟"

"جب آپ حکم دیں؟"

"شام کو چھ بجے۔ لیکن اس دفتر میں نہیں میری رہائش گاہ کا پتہ نوٹ کر لو۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔" مرزا جمال بیگ نے کہا اور پتہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے کاغذ پر لکھے ہوئے پتے پر نگاہ دوڑائی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔" اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ مرزا جمال بیگ سے رُخصت ہو کر واپس چل پڑی۔ بس میں بیٹھے بیٹھے وہ ان واقعات کے بارے میں سوچتی رہی تھی کہ مرزا جمال

بیگ کی کہانی تو اس کی کہانی سے بھی زیادہ دردناک ہے۔ اس شخص سے تو اس کا سب کچھ چھن گیا ہے۔ کتنا زخمی ہے اس کا دل۔ وہ زیادہ عمر رسیدہ نہیں ہے لیکن اپنی عمر سے کتنا بوڑھا نظر آتا ہے۔ بیوی اور بیٹی کا زخم سینے میں لیے پھر رہا ہے۔ اس کی تو ساری زندگی برباد کر دی گئی۔ دولت چھن گئی، اولاد چھن گئی۔ طویل عرصہ جیل میں گزارا، کیا بچا اس کے پاس سوائے ایک آس کے۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو یاد آئے تو مرینہ کا دل بھر آیا۔ کتنا بے بس ہے وہ۔

گھر پہنچ گئی۔ محلے کا ماحول بڑا محبت بھرا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس ماحول نے اس کا دل تھام رکھا تھا۔ برابر رہنے والی خالہ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دوسرے گھروں میں بھی اس کے لئے بڑی محبت تھی۔ سبھی نے پیشکش کی تھی کہ وہ شادی کر لے اور اگر نہ کرنا چاہے تب بھی اس کی اکیلی جان کافی ہے۔ بچیوں کو تو پڑھا ہی دیا کرتی ہے۔ اس کی دو وقت کی روٹی کسی پر بھاری نہیں پڑے گی لیکن اس نے کسی کی یہ مدد قبول نہیں کی تھی اور کہا تھا کہ خالہ ہاتھ پاؤں سلامت رہنے چاہئیں۔ بھیک مانگ کر گزارہ کرنا بہت ہی افسوس ناک بات ہے میں اگر جیوں گی تو اپنے بل پر جیوں گی آپ کو پتہ ہے کہ میری ماں نے کیسی زندگی گزار دی ہے۔

بہرحال دوسرے دن شام کے چھ بجے وہ مطلوبہ جگہ پر وہ بنگلہ تلاش کر کے پہنچ گئی۔ اچھا خوبصورت بنگلہ تھا جبکہ آفس کی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ راستے میں پھر وہ جمال بیگ کے بارے میں سوچتی آئی تھی۔ بہرحال اس گھر میں دو ملازم تھے ایک کار بھی کھڑی تھی۔ یہ کار اس نے دفتر کے باہر دیکھی تھی۔ ملازموں میں ایک بوڑھی عورت تھی اور اس کا بیٹا تھا۔ مرزا جمال بیگ نے شفقت سے پُر مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس نے بھی گرم جوشی سے مرزا جمال بیگ سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ جمال بیگ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا میں دوہری کیفیت کا شکار تھا اور سوچتا تھا کہ ممکن ہے تم نہ آؤ۔"

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا سر کیوں نہ آتی؟"

"اچھا یہ بتاؤ ٹھنڈا پیو گی یا چائے؟"

"سر چائے پلوا دیجئے۔" جمال بیگ نے بوڑھی عورت کو آواز دی اور جب وہ اندر آ گئی تو بولا۔

"باجی یہ میری بیٹی ہے۔ اسے پہچان لو یہ گھر اس کا ہے۔ میرے پیچھے اگر یہ کبھی آ جائے تو اس کا خیال رکھا جائے۔ اب ذرا چائے وغیرہ لے آؤ لیکن خالی نہیں۔"

"جی بھیا جی۔" بوڑھی عورت چلی گئی اور مرینہ مسکرانے لگی۔ چائے کے ساتھ کافی لوازمات بھی تھے۔ اس نے بے تکلفی سے یہاں سب کچھ کھایا پیا۔ پتہ نہیں کیوں اسے ایک عجیب سا اعتماد محسوس ہو رہا تھا۔ ادھر جمال بیگ کے چہرے پر مسرت کے آثار دیکھے تھے۔ وہ اس کی آمد اور اپنائیت سے بے حد خوش تھا۔ پھر کام کی باتیں شروع ہو گئیں۔

"جو درخواست تم نے میرے دفتر بھیجی تھی اس پر تمہارا پتہ لکھا ہوا ہے میں نے غور نہیں کیا تھا کہ کیا پتہ ہے ویسے بتاؤ گی کہ کون سا علاقہ ہے اور کیسا مکان ہے؟"

"سر غریب لوگوں کی بستی میں ایک معمولی سا مکان ہے لیکن میرے لئے وہ انمول ہے کیونکہ اس سے میری زندگی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

"لیکن بیٹی ہم جو کام شروع کرنے والے ہیں اس کے لئے تمہیں ایک بہتر مکان کی ضرورت ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو جاؤ۔"

"عارضی طور پر تو ممکن ہے جناب مستقل نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں جذباتی طور پر اس مکان سے وابستگی رکھتی ہوں۔ میرے پڑوسی میرے لئے ایک خاندان کی مانند ہیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں اگر اس سلسلے میں مجھے عارضی طور پر کہیں جانے کی ضرورت پیش آئے تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"جو منصوبہ میرے ذہن میں ہے اس میں کوئی کام عارضی نہیں ہے۔ خیر میں پہلے تم سے اس منصوبے کے بارے میں گفتگو کر لوں اس کے بعد کوئی فیصلہ کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم اس شخص کے لئے دل میں کتنی نفرت رکھتی ہو جس نے تمہاری زندگی کو ناسور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس نے تمہاری ماں کو تم سے چھین لیا۔"

"نفرت۔" مرینہ آہستہ سے بولی۔

"نفرت اس کے لئے معمولی لفظ ہے سر میرے سینے میں انتقام کی آگ سُلگ رہی ہے۔ اگر مجھے اس سے انتقام لینے کا موقع مل جائے تو میں اس کے لئے جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ کوئی احساس، کوئی طلب اس سے زیادہ شدید نہیں ہے۔ میرا سارا وجود انتقام ہے۔ میری اپنی ذات کی ہر خواہش، ہر خوشی اس انتقام کے لئے وقف ہے۔ میں اس شخص سے ہولناک بدلہ لینا چاہتی ہوں، جس نے مجھے میری ماں کی آخری جھلک بھی نہیں دیکھنے دی۔"

"جذبوں کی شدت ہی فتح مند کرتی ہے۔ ہر احساس، ہر لگن چھوڑ دو، زمین، مکان، پڑوسی کوئی کچھ نہیں ہے۔ مقصد حیات کے لئے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات بتاتا ہوں۔" جمال بیگ کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے۔

"جی سر بتایئے۔" مرینہ نے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ رب نواز کا ایک بیٹا اور بیوی بھی ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ بیٹا اس کے ساتھ رہا تھا، رب نواز نے اپنے بیٹے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف گورنس وغیرہ رکھی تھیں، میری کمائی ہوئی دولت سے وہ خوب عیش کر رہا تھا۔ باپ کے خون کے اثرات بیٹے میں منتقل ہوئے اور وہ بھی باپ کی طرح آوارہ اور اوباش فطرت کا مالک نکلا۔ اب وہ آوارہ مزاج اور اوباش لڑکا بن چکا ہے۔ حسن پرستی اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ باپ کی دولت معاون ہے اور اسے کوئی مشکل نہیں ہے جبکہ میری بیوی اور میری بچی۔"

جمال بیگ کی آواز بھر آئی، کچھ لمحے وہ خود کو سنبھالتا ہوں...... "خیر میں کہہ رہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ......" جمال بیگ کے انداز میں جھجک سی تھی۔

"جی کہیے۔"

"تم میرے بارے میں کوئی بُری بات نہیں سوچو گی بیٹی۔ خدا تمہاری عزت تمہاری آبرو محفوظ رکھے۔ کبھی کبھی ہم اپنی سطح سے کافی نیچے آ کر سوچتے ہیں، لیکن یہ

ہماری مجبوری ہوتی ہے۔ میں اس بات کا مکمل طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ تم انتہائی، شریف ماں باپ کی شریف النفس اور اعلیٰ کردار لڑکی ہو، لیکن بیٹا کبھی کبھی بُرے راستوں سے گزرنے کے لئے کیچڑ میں پاؤں ڈالنا پڑتے ہیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اختر نواز سے راہ رسم بڑھانا ہوں گے، اسے اپنے دام میں لانا ہوگا، اس کے لیے تمہیں خود کو یکسر بدلنا ہوگا۔ اپنی ذات کے ہر احساس کو کچلنا ہوگا۔ اس کے باوجود میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ خوب سوچ سمجھ کر لو غور کرلو۔ خدا تمہیں ہر طرح سے محفوظ رکھے۔'' مرینہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''سوچ فکر غور وغوض سچے جذبوں کے مظہر نہیں ہوتے جناب۔ میں نے اپنی ذات کو اس سے انتقام کے لئے وقف کر دیا ہے تو پھر میری ذات میرے لئے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اگر میں اپنے مستقبل اور اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچوں تو پھر جذبوں کی بات بالائے طاق رکھنا ہوگی۔ اس پوری دنیا میں میرا اب کوئی نہیں ہے۔ وہ ساری باتیں جو زندگی کی خوشیوں سے تعلق رکھتی ہیں میرے لئے بے مقصد ہیں اور میں جانتی ہوں جناب کہ اگر زندہ رہی تو مصائب اور تکلیف میں گزار کر بہرصورت سانسوں کی آخری حد تک جا سکتی ہوں۔ ممکن ہے اس دوران میری زندگی کو کوئی ایسا سہارا بھی مل جائے جو میرے احساسات کی چبھن میں کچھ کمی کر دے۔ لیکن اس کے باوجود جب بھی کبھی ماضی پر نگاہ ڈالوں گی تو وہ سارے کانٹے بدن میں چبھنے لگیں گے جو میرے ماضی سے وابستہ ہوں گے۔ اس چبھن سے بچنے کے لئے، اس احساسِ محرومی اور ناکامی کو مٹانے کے لئے اگر مجھے یہ سہارا مل گیا ہے تو میں اسے کھونا پسند نہیں کروں گی۔ آپ بالکل مطمئن رہیے۔ مرینہ مر چکی ہے لیکن اس کا انتقام زندہ ہے اور میں نے اپنے بقیہ سانس اسی انتقام کیلئے وقف کر دیئے ہیں۔ آپ میرے جذبوں کی شدت سے اب پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ میری زندگی اب کسی شریف لڑکی کی زندگی نہیں ہے۔ یہ بات کبھی بھی نظرانداز نہیں کی جائے گی کہ میں جیل جا چکی ہوں۔ بہرحال میں آپ کے ہر مشورے پر عمل کروں گی اور آپ کبھی میرے جذبوں میں مجھے کمزور نہیں پائیں گے۔'' مرینہ نے کہا اور جمال بیگ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر

اس نے کسی قدر مسرور لہجے میں کہا۔

''تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے رب نواز! تمہاری دراز رسی اب تنگ ہونے کو ہے اور اس پھندے کی گرفت تم بہت جلد اپنی گردن پر محسوس کرو گے۔ تم دیکھو گے کہ تڑپانے والے خود کس طرح تڑپتے ہیں۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا تمہیں کہ کسی پر ظلم کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔'' پھر خاصی دیر تک خاموشی طاری رہی تھی۔ مرینہ اپنے طور پر کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ کو یقین ہے کہ رب نواز کو آپ کی یہاں موجودگی کا علم نہیں ہے؟''

''ہاں مجھے یقین ہے۔''

''کیا وہ آپ کی فرم کے نام سے بھی واقف نہیں ہے، میرا مطلب ہے کاروباری لوگ تو ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے علم میں آ جائیں اور وہ آپ کی طرف سے ہوشیار ہو جائے۔ ویسے بھی یہ بات تو اسے معلوم ہو گی کہ آپ کو جیل سے رہائی حاصل ہو گئی ہے۔''

''اصل میں دولت بڑی نانجار چیز ہوتی ہے۔ انسان سے اچھے احساسات کے ساتھ عقل بھی چھین لیتی ہے۔ وہ دولت میں کھو کر انسانیت کو بھول چکا ہے اور یہ ہی قدرت کا انتقام ہوتا ہے۔ وہ انسان کو صحیح سوچوں سے اتنا دور کر دیتی ہے کہ اسے یہ بھی احساس نہیں رہتا کہ وہ کب بُرائی کر رہا ہے اور کیسے کیسے اس کی ان برائیوں سے نقصان پہنچا ہے۔ یہی چیز تو اسے بھٹکا اور بہکا دیتی ہے اور یہیں سے قدرت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پہلے وہ بھٹکتے ہیں اور اس کے بعد ختم ہو جاتے ہیں، سمجھیں بیٹی یہ سب کچھ مکافاتِ عمل ہے اور ایسا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک۔'' مرینہ نے گردن ہلا کر کہا۔

''میں نے جان بوجھ کر نام تبدیل کیا ہے اور نیا نام اپنا کر یہ کاروبار شروع کیا ہے تا کہ اس کی نگاہوں سے محفوظ رہوں لیکن کچھ اور باتیں بھی میرے ذہن میں ہیں مثلاً یہ کہ اگر تم اس کے بیٹے اختر نواز سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو یقینی طور پر تمہارے پاس اس کا آنا جانا بھی ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بیٹے کی کاوشوں

سے واقف ہو کر کبھی اس کا تعاقب بھی کرے اور وہاں تک پہنچ جائے جہاں تم موجود ہو بہرصورت ہمیں مکمل طور پر ہوشیار رہنا چاہیے۔''

''میں آپ کی ہر ہدایت کا خیال رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بہت جلد سارے انتظامات مکمل کرلوں گا۔''

ٹھیک تین دن کے بعد وہ ایک خوبصورت سے چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس کو فلیٹ کی خوبصورتی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چھوٹا سا گھر ہی اس کی جنت تھی جہاں وہ ماں جی کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں جی کے سوا اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ باپ کے بارے میں کبھی ماں جی نے اسے تفصیل نہیں بتائی تھی۔ بس جب بھی اس نے یہ سوال کیا تو ماں جی نے اسے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ زمین و آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگیا ہے اور بس۔ خود اس کے ذہن میں بھی کوئی خاص تجسس نہیں اُبھرا تھا۔ اور اب وہ اس آسائش میں تھی جہاں ہر آسائش موجود تھی۔

ایک دلچسپ کھیل کا آغاز ہوا تھا۔ اگر یہ کھیل کسی اور انداز کا ہوتا تو دوسری بات تھی لیکن اس کے پسِ پشت انتقامی جذبے تھے، اس لیے اس کی نوعیت مختلف ہوگئی تھی۔

اختر نواز کے معمولات اور جو کچھ بھی ہوں لیکن اسکائی ویو کلب اس کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ اس کی ہر شام وہاں گزرتی تھی۔ مرینہ نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں کسی کلب کا تصور بھی نہیں تھا، نہ ہی اسے وہاں کے آداب آتے تھے، لیکن مسز کپاڈیا کی پندرہ دن کی تربیت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا۔

''میں تمہارے کو بولے یہ دور بس بیوقوف بنانے کا ہے۔ تم اپنے کو دوسروں سے الگ بنا لو۔ سب لوگ تمہارے پیچھے دُم ہلائے گا۔ میں تمہارے کو بتائے گا کہ دوسروں سے الگ کیسے نظر آیا جا سکتا ہے۔''

جمال بیگ نے ہر طرح کے انتظامات کر دیئے تھے چنانچہ اسے کلب کی ممبر شپ

مل گئی اور آخر کار وہ اوباشوں کی اس جنت میں داخل ہوگئی۔ حسین ترین عمارت تھی، حسین لوگوں سے آباد لیکن تہذیب و اخلاق سے بہت دور۔ ہر شخص اپنی دُھن میں مست، رقص و سرود، رنگین بوتلوں کی کھنک، پیمانوں کی جلترنگ، بھٹکے ہوئے آوارہ قہقہے......

اس وحشت ناک ماحول میں اس نے پہلا قدم رکھا اور اس کا خون خشک ہونے لگا۔ یہاں جتنے نظر آ رہے تھے سب کے سب ہی رب نواز تھے، اپنے اس خوف کو اس نے یہ سوچ کر دُور کرلیا کہ وہ یہاں ان کی ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بننے نہیں آئی بلکہ ان سارے رب نوازوں سے انتقام لینے آئی ہے۔ اس احساس نے اسے مطمئن کیا اور وہ اپنی مخصوص میز پر جا بیٹھی۔ اس نے بے شمار نگاہوں کو اپنی طرف نگراں پایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہاں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکیاں اور خواتین موجود تھیں لیکن اس کا حسن سادہ اس ماحول کے لیے اجنبی تھا اور مسز کپاڈیا کا مشورہ بالکل درست ثابت ہو رہا تھا۔ جہاں میک اپ کی تہوں کے نیچے بگڑے ہوئے چہرے اپنی اصل چھپانے کی کوششوں میں مصروف تھے، وہاں اِس چہرے کی سادگی اور حقیقی حسن کی کشش منفرد تھی۔

آوارہ مزاجوں کے اس ریوڑ میں سب سے پہلے جو لمبوترا چہرہ اس کی طرف لپکا، اس کا نام نوشاد تھا۔ ایک ارب پتی باپ کا بگڑا ہوا بیٹا......!

''آپ کی اجازت سے......'' اس نے بے تکلفی سے اس کے سامنے والی کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو......'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔ وہ بے حد اعتماد کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''اسکائی ویو میں اس حسین اضافے پر سب سے پہلے میں خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔''

''شکریہ......!''

''میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے؟''

''کیا......؟'' وہ بولی۔

''آپ پہلی بار یہاں آئی ہیں۔''

"جی......! بالکل صحیح اندازہ ہے آپ کا۔"

"میرا نام نوشاد غزنوی ہے......جی آر غزنوی گروپ الیاس غزنوی کے مالک کا بیٹا!"

"میں مرینہ ہوں۔"

"صرف مرینہ......!"

"مکمل ہوں۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور وہ ایک دم سنبھل گیا۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں ہے، کیا پئیں گی؟"

"آپ میری میز پر مہمان ہیں، آپ بتایئے؟"

"لیکن کلب کے پہلے دن آپ ہماری مہمان ہیں۔ میں آپ کے اعزاز میں پورے کلب کو کچھ پلانا چاہتا ہوں، اعلان کروں؟"

قطعی نہیں، براہِ کرم یہ تماشا نہ کریں۔ دوسری بات یہ کہ میں صرف چائے یا کافی پیتی ہوں۔"

"آنکھوں کی رنگت تو کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ کبھی ان کی گلابیاں دیکھیں تو یقین کریں خود ان کی دیوانی ہو جائیں گی۔" وہ رومانوی لہجے میں بولا۔

"مجھے دیوانگی سے ڈر لگتا ہے۔"

"اور ہم جیسے دیوانوں سے؟"

"کلب میں اپنی پہلی شناسائی پر میرا اعتماد قائم ہونے دیجئے۔"

"او کے، او کے۔" اس نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا۔

دوسرے بہت سے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے اور نوشاد کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ اس نے لیتے ہوئے کہا۔

"قسم کھا کر کہتا ہوں آپ کی قربت نے اس کافی میں بھی نشہ گھول دیا ہے، بڑا سرور مل رہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا، یہ کمبخت بیچ میں کہاں آن مرا، اسے تو اختر نواز کی تلاش تھی۔ جس کی تصویر اسے دکھا دی گئی تھی اور اس نے وہ چہرہ ذہن نشین کر لیا تھا۔

"آپ نے پورا کلب تو نہیں دیکھا ہوگا؟"

"کہاں......پہلی بار تو آئی ہوں۔"

"تو آیئے میں آپ کو کلب دکھاؤں!" نوشاد نے پیشکش کی اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔

یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ گیمز ہال میں اس نے اختر نواز کو دیکھا تھا۔ اس نے ایک نگاہ میں اسے پہچان لیا تھا۔ ویسے بھی اس کے نقوش میں رب نواز کی جھلک تھی اور پہلی ہی نگاہ میں اسے دیکھ کر مرینہ کے دل میں نفرت کی ایک شدید لہر اُٹھی تھی۔ مرینہ نے سرسری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا لیکن خود وہ کلب کے بیشتر نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ جن میں اختر نواز بھی تھا۔

البتہ دوسری شام وہ نوشاد سے پہلے اس کے پاس آ گیا تھا۔ کلب میں ایک دوسرے سے شناسائی میں تکلفات نہیں ہوتے۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"ہیلو مس مرینہ......!"

"ہیلو......!" وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی۔

"ہمارا تعارف کب اور کہاں ہوا؟"

"شاید آسمانوں میں، جب فرشتے مٹی سے ہمارے وجود تخلیق کر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"شاید اس وقت تک ہمارے نام نہیں رکھے گئے تھے۔" مرینہ نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، ویسے میرا نام اختر نواز ہے اور آپ......آپ تو گزری ہوئی کل کا اہم ترین موضوع تھیں۔ آپ تو شاید دس بجے رات تک چلی گئی تھیں لیکن آپ کا تذکرہ رات کے ایک بجے تک یہاں رہا تھا۔"

"اوہو......! ایسی کیا خاص بات تھی مجھ میں؟"

"آپ بہت مختلف ہیں۔ اس مصنوعی ماحول میں بالکل اصلی، اور یہی بات من موہنی ہے۔ یہ کچھ نہ ہو کر بھی خود کو بہت کچھ سمجھتی ہیں اور آپ سب کچھ ہو کر بھی بالکل

سادہ ہیں۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں جنہوں نے آپ کو سب سے مختلف بنا دیا ہے۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً یہ کہ نوشاد کو اپنی گاڑی جیگوار پر بہت ناز ہے اس کا خیال ہے کہ کوئی بھی لڑکی جیگوار کے سحر سے نہیں بچ سکتی لیکن آپ نے اسے بُری طرح ٹھکرا دیا۔"

"خدا کی پناہ...... ایک ہی دن میں اتنی ساری باتیں ہو گئیں میرے بارے میں......!" مرینہ نے بڑی آسودگی محسوس کی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے مشن میں اطمینان بخش طور پر آگے بڑھ رہی ہے۔

☆......☆......☆

وہ خود حیران تھی کہ وہ بڑی عمدگی کے ساتھ اختر نواز سے باتیں کر رہی تھی۔ جب کہ اس سے پہلے اس کی زندگی میں اس طرح کا لمحہ نہیں آیا تھا جب اس نے کسی کے ساتھ لگاوٹ بھرا انداز اختیار کیا ہو۔ نوشاد سے بھی اس کی بات چیت ہوئی تھی اور نوشاد بھی اس کی جانب سے غیر مطمئن نہیں تھا لیکن نوشاد کا معاملہ صرف ایک تجربے کی حیثیت رکھتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ کس حد تک آگے جا سکتی ہے اور پھر یہ بات بھی اس کے لئے بڑی دلچسپی اور حیرت کا باعث تھی کہ اختر نواز کو تلاش کرنا اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ثابت ہوا بلکہ اختر نواز خود ہی اسے تلاش کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ کلب کی زندگی کے بارے میں اسے کوئی تجربہ نہیں تھا ورنہ شاید اسے اس پر اتنی حیرت نہ ہوتی۔ اسے اختر نواز کی آواز سنائی دی۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ باتیں ہوئیں آپ کے بارے میں، ویسے مس مرینہ ایک سوال کی اجازت دیں مجھے۔"

"ہاں پوچھئے۔"

"آپ نے نوشاد کے ساتھ جانے کے بجائے ٹیکسی کو کیوں ترجیح دی؟"

"نوشاد صاحب سے میری ملاقات کل ہی ہوئی تھی، وہ سارے وقت میرے ساتھ رہے، جسے میں نے بس اخلاقاً ہی برداشت کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ ضرورت سے زیادہ ہی مخلص ہو گئے تھے اور انہیں نجانے کیوں یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے بھی ان کی اس طویل قربت کو پسند کیا ہے اور میری واپسی انہی کے ساتھ ہو گی بہرحال میں نے ان کی پیشکش قبول نہ کر کے انہیں محتاط رہنے کا اشارہ دیا تھا۔" آخر

میں مرینہ کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔

''خدا کے لئے مجھ سے کوئی گستاخی ہو جائے تو معاف کر دیجئے ورنہ یہ سب میرا مذاق اُڑائیں گے، ارے ارے...... وہ دیکھئے نوشاد صاحب آ رہے ہیں۔'' اختر نواز نے ایک دم کہا لیکن مرینہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''کمال ہے مس مرینہ! میں کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا بلکہ میں تو بے چین تھا کہ آپ کیوں نہیں آئیں۔'' پھر وہ اختر نواز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''ہیلو اختر......!''

''ہیلو......'' اختر نواز نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ نوشاد پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آیئے مرینہ میں کچھ اور لوگوں سے آپ کو ملاؤں۔ وہ سب آپ کے منتظر ہیں۔''

''کون لوگ نوشاد صاحب! آپ پلیز ہمیں گفتگو کا موقع دیں۔ میں اختر نواز صاحب سے کچھ ذاتی باتیں کر رہی ہوں امید ہے آپ ہمیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔'' مرینہ نے کہا اور نوشاد بھونچکا رہ گیا لیکن اختر نواز کی سفید جلد کے نیچے سرخی چمک اُٹھی تھی۔ نوشاد کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ چند لمحات وہ بالکل ساکت کھڑا رہا پھر خفت مٹانے کے لئے بولا۔

''اوہو......ٹھیک ہے۔ آپ یوں کیجئے مس مرینہ کہ جب یہاں سے فارغ ہو جائیں تو اس طرف نکل آئیں میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' کوئی اور جملہ سننے سے پہلے وہ جلدی سے واپس مڑ گیا اور کچھ لمحوں کے بعد اس ہال سے باہر نکل گیا۔ مرینہ مسکرا کر اختر نواز کو دیکھنے لگی۔ اختر نواز کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ جیسے آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔

مرینہ نے کہا۔

''یہ نوشاد صاحب بھی خوب ہیں، کمال کے آدمی ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے...... چلئے چھوڑیئے، خود ہی عقل آ جائے گی۔''

''اب آپ یہ بتایئے میں آپ کے لئے کیا منگواؤں مس مرینہ؟'' اختر نواز نے کہا۔

''میں کافی پیوؤں گی آپ اپنے لئے جو چاہے منگوا لیں۔''

''نہیں میں بھی آپ کے احترام میں کافی ہی پیوؤں گا۔''

''شکریہ......'' اصل میں مَیں بہت آگے کی چیز نہیں ہوں اختر نواز صاحب پہلی بار میں نے کسی کلب میں داخل ہونے کی جرأت کی ہے، میرا اسٹیٹس بھی وہ نہیں ہے جو آپ لوگوں کا ہے۔ معمولی حیثیت کی ملک ہوں، لیکن تنہا زندگی ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ اپنے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائی تو یہ جرأت کر ڈالی۔ میں نہیں جانتی کہ میں کلب کے اس ماحول میں فٹ ہو بھی سکوں گی یا نہیں۔ چونکہ بہر حال میں اتنی اعلیٰ سوسائٹیوں سے ناواقف ہوں۔''

''آپ ایسی باتیں نہ کریں مس مرینہ، آپ یقین کیجئے کہ آپ کی شخصیت ان تمام چیزوں پر بھاری ہے اور ایک بات آپ سے میں اور عرض کرنا چاہتا ہوں، خدا کے لئے آپ مجھے نوشاد تصور نہ کریں۔ میں بھی کلب میں کوئی نیک نام انسان نہیں ہوں، لیکن لوگوں کی عزت و احترام کرنا جانتا ہوں۔''

''اور یہ معمولی بات نہیں ہے اختر نواز صاحب، بہت بڑی بات ہے کہ انسان اپنی خامیوں پر نگاہ ڈال لے۔''

''جب بھی آپ مجھ سے بیزاری اور اُکتاہٹ محسوس کریں براہ کرم مجھے بتا دیجئے میں چلا جاؤں گا۔'' اختر نواز نے کہا۔ لیکن مرینہ تو یہاں آئی ہی اس کے لئے تھی وہ کیسے بیزاری کا اظہار کر سکتی تھی۔ دس بجے کے قریب اس نے اجازت مانگی اور بولی۔

''اس سے زیادہ رُکنا مناسب نہیں ہو گا اختر صاحب۔''

''ہاں ہاں ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ حالانکہ صحیح معنوں میں کلب میں تو زندگی کے آغاز کا وقت ہی یہ ہے، لیکن انسان کو اپنے نظریات سے ہمیشہ مخلص ہونا چاہیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔''

''آپ تو ابھی رُکیں گے یہاں جیسا آپ نے فرمایا؟''

''نہیں بالکل ضروری نہیں ہے، میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔'' اختر نواز نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"تب پھر براہ کرم مجھے میرے فلیٹ پر ڈراپ کر دیں۔" مرینہ بولی اور اختر نواز کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ جلدی سے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا، گرے کلر کی ایک خوبصورت کار کا دروازہ کھول کر اس نے مرینہ کو اشارہ کیا اور مرینہ کار میں آ بیٹھی۔ اختر نواز دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس کی ہر ادا سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مرینہ کے اپنائیت کے اس انداز سے بہت خوش ہے۔ کچھ لمحے یہ خاموشی طاری رہی پھر مرینہ نے کہا۔

"میں نے بڑی بے تکلفی سے آپ کو زحمت دی ہے اختر نواز صاحب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں خواہ مخواہ آپ کو وہاں سے لے آئی۔"

"نہیں مس مرینہ پلیز اگر آپ نے مجھے اتنی عزت دی ہے تو خدارا اسے برقرار رہنے دیں۔ میں آپ کا بے شکر گزار ہوں گا۔" اختر نواز نے کسی قدر گھمبیر آواز میں کہا اور مرینہ مسکرانے لگی۔ وہ اختر نواز کو راستہ بتاتی گئی اور کچھ دیر کے بعد نئی چمکتی کار اس کے فلیٹ کے سامنے رُک گئی۔

"اب یہ تو ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ آپ یہاں تک تشریف لائیں اور میں آپ کو باہر ہی سے جانے دوں۔ آئیے میں آپ کو اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی کافی پلواؤں گی۔" اختر نواز سحر زدہ سا نیچے اتر گیا اور مرینہ اسے فلیٹ میں لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں اختر کو بٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ کو میری حیثیت سے اندازہ ہو گیا ہو گا۔ دیکھئے یہ بلند پروازیاں ہیں ہماری۔ رہتی یہاں ہوں اور پہنچنا آپ لوگوں تک چاہتی ہوں۔" مرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بعض شخصیتیں کسی خول میں نہیں رہتیں۔ آپ اپنی ذات میں جو کچھ ہیں وہ اتنی ہیں کہ آپ کے دوستوں میں شامل ہونے والا خود کو خوش قسمت ترین سمجھتا ہے۔" مرینہ نے اپنے چہرے پر گھمبیرتا طاری کی اور پھر بولی۔

"اصل میں اختر صاحب میں اس دنیا میں محبتوں سے محروم ہوں، وہ محبتیں جن

پر انسان آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے، والد صاحب تھوڑا سرمایہ چھوڑ گئے تھے جس کے سہارے زندہ ہوں لیکن مستقبل کا خوف ذہن میں موجود ہے اور شاید یہی خوف مجھے تنہائی اور ویرانی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ دیکھیں زندگی آگے چل کر کیا کہتی ہے۔" مرینہ نے سچ کہا اور جھوٹ کو کسی مناسب موقع کے لئے اٹھا کر رکھ دیا۔

"اور عزیز واقارب نہیں ہیں آپ کے؟" اختر نواز نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے عرض کیا نا کہ عزیزوں سے محروم ہوں۔ پہلے اس شہر میں نہیں تھی، اپنے ماحول سے اُکتا کر یہاں آ گئی ہوں اور سوچ رہی ہوں زندگی گزارنے کے لئے کوئی ایسا ذریعہ معاش تلاش کروں جو میری ضروریات پوری کر دے۔"

اختر عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ نجانے اس کے ذہن میں کیا کیا خیالات تھے۔ بہرطور اس نے ان کا اظہار نہیں کیا اور تھوڑی دیر جذباتی سی گفتگو جاری رہی پھر کافی پی گئی اور اس کے بعد اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ چلتے چلتے بولا۔

"کل تشریف لائیں گی کلب میں؟"

"ہاں یقیناً اور سیدھی آپ کے پاس پہنچوں گی۔ انسانوں کے انتخاب کا کچھ تھوڑا سا سلیقہ مجھے بھی ہے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔" اختر نواز کچھ لمحے کھڑا محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد پُر مسرت انداز میں گردن ہلاتا ہوا واپسی کے لئے آگے بڑھ گیا۔

مرینہ کو خود بھی اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنی کامیابی سے وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو اس نے کبھی کیا نہیں تھا۔ اختر نواز اس کی ماں کے قاتل کا بیٹا تھا۔ رب نواز نے اسے ایک سزا یافتہ لڑکی بنا دیا تھا۔ وہ ایک عزت دار لڑکی نہیں کہلوا سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے انتقام کی آگ روشن تھی۔

پوری محنت سے وہ اختر نواز کے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ اختر نواز کے بارے میں اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ باپ کی طرح آوارہ مزاج نہیں ہے۔ وہ صرف اس لیے ایک بُرا انسان تھا کہ بُرے باپ کا بیٹا تھا وہ باپ کی حرکتوں سے واقف

تھا۔وہ جانتا تھا کہ آوارہ فطرت باپ نے اس کی ماں کو اپنی لاپرواہیوں اور برائیوں سے مار دیا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ باپ اپنی دولت کا بڑا حصہ اپنی آوارگی پر خرچ کرتا ہے اور اختر نواز کو اتنی کھلی آزادی نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بگڑے ہوئے نوجوان کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔لیکن اب جو اسے اپنی من پسند لڑکی کی توجہ حاصل ہوئی اور اس نے محسوس کیا کہ مرینہ اسے اپنے دل میں بہت بڑا مقام دے چکی ہے تو اس کی آوارگیاں بھی راہ راست پر آنے لگیں۔مرینہ سے اب اس کی خوب بے تکلفی ہو گئی تھی اور صرف کلب میں ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ملاقاتیں فلیٹ میں ہی ہوتی تھیں۔ وہ بے تکلفی سے اس کے فلیٹ پر آجاتا تھا اور وہاں سے پروگرام بنتے تھے۔ مرینہ کے بغیر اب اس سے وقت نہیں کٹتا تھا۔ایک شام وہ شہر سے دور ایک خوبصورت پوئنٹ پر گئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے یہ بارش ہلکی تھی پھر تیز ہو گئی اس پوائنٹ پر وہ تنہا نہیں تھے۔ دوسرے لوگ بھی اس خوبصورت مقام کی سیر کرنے کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے۔لیکن بادلوں کا رنگ دیکھ کر سبھی وہاں سے پلٹ پڑے اور یہ دونوں تقریباً تنہا رہ گئے۔بارش جب تیز سے تیز تر ہونے لگی اور گہری تاریکی چھا گئی تو مرینہ نے واپسی کے لئے کہا۔

''خدا کی قسم مرینہ اس موسم میں آپ کو فلیٹ پر چھوڑنے کے بعد جو تنہائی میرے وجود پر مسلط ہوگی اسے برداشت نہیں کر سکوں گا۔'' اختر نے افسردگی سے کہا۔

''لیکن جناب یہاں تو رات نہیں گزاری جاسکتی ۔سر چھپانے کی کوئی جگہ دور دور تک نہیں ہے۔'' مرینہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ایک شرط ہے واپسی کی؟'' اختر نواز نے کہا۔

''جی جی فرمائیے۔''

''رات کو گھر واپس نہیں جاؤں گا بلکہ آپ کے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ بارش کا لطف اٹھاؤں گا۔ ہم دونوں باتیں کریں گے اور کافی پی کر وقت گزاریں گے۔ بولئے میری یہ شرط منظور ہے؟'' مرینہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر ہنس کر بولی۔

''ٹھیک ہے منظور ہے۔''

''تب پھر آیئے۔'' اختر نواز بہت زیادہ خوش ہو گیا اور دونوں کار کی جانب چل پڑے۔ بارش دُھواں دھار ہو رہی تھی۔ اختر نے اسے کار میں دھکیلا اور خود بھی اندر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔ وائپر تیز رفتاری سے پانی کی دھاریں صاف کرنے لگے۔لیکن اس کے باوجود سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سخت خطرناک ہو گئی تھی۔ اختر نے کار کی روشنی جلالی تھی اور کار کی رفتار سست کر دی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے کار چلا رہا تھا لیکن ایک جگہ اسے رُکنا پڑا۔شہر سے باہر ایک برساتی ندی یہاں تک آنے والے راستے کو کاٹتی تھی اور اس ندی پر کوئی پل وغیرہ نہیں تھا۔ بلکہ سڑک نشیب سے گزرتی تھی بارش میں نشیب بھر جاتے تھے اور یہاں سے گزرنا ممکن نہیں رہتا تھا۔اس وقت بھی یہی ہوا۔گو بارش زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اتنی تیز تھی کہ آن کی آن میں ندی بھر گئی اور طوفانی بہاؤ دور ہی سے محسوس کیا جانے لگا۔اختر نے کار کو بریک لگائے اور تشویش بھری نگاہوں سے ندی سے گزرتے ہوئے پانی کے ریلے کو دیکھنے لگا پھر اس نے کہا،

''جی محترمہ فرمائیے کیا حکم ہے؟''

''خدا کی پناہ! یہ تو بہت خوفناک بات ہو گئی اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے اب کیا ہو گا؟'' مرینہ نے پریشانی سے کہا۔

''کچھ بھی نہیں اس میں پریشانی کی کیا بات ہے میں کار کو ریورس کر کے سڑک سے اُتار لیتا ہوں ہم اسے بھی آپ کے فلیٹ کی بالکونی تصور کر سکتے ہیں۔'' اختر نواز نے پر اطمینان لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ تو بہت خوفناک جگہ ہے اس ویرانے میں......''

''نہیں مس مرینہ! آج تو اس ویرانے کی تقدیر کھل گئی ہے۔ میں بے حد خوش ہوں کوئی تردّد نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' اختر نے کہا اور کار ریورس کرنے لگا۔شیشے چڑھے ہوئے تھے۔اختر نے اس کے لئے سیٹ کھول دی اور بولا۔

''جی آرام فرمائیے۔'' مرینہ سیٹ پر دراز ہو گئی۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔موسم خنک ہو گیا تھا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ یہ خاموشی طویل ہو گئی تو مرینہ نے اسے

مخاطب کیا۔

''جی...... آپ نے یہ زبان کیوں بند کر رکھی ہے؟ اتنی طویل خاموشی؟''

''میں خوفزدہ ہوں مس مرینہ! اگر کوئی بُری بات زبان سے نکل گئی تو نجانے آپ کیا سمجھیں؟'' اختر کی آواز میں لرزش تھی۔

''مجھے یقین ہے آپ کوئی غلط بات نہیں کریں گے۔''

''اتنا اعتماد ہے مجھ پر؟''

''ہاں۔''

''یہ وعدہ کہ میری کسی بات کا برا نہیں مانا جائے گا؟''

''وعدہ۔'' مرینہ نے جواب دیا۔

''تو میڈم میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب آپ کے بغیر ایک لمحہ مشکل ہو جاتا ہے میرے لئے۔ ایک لمحے کی دوری مجھے پسند نہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ مرینہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اختر نواز کا سانس پھول گیا تھا۔

مرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اختر نواز نے کہا۔

''آپ کا ماحول مجھے برداشت کر سکے گا اختر؟''

''صرف آپ مجھے قبول کر لیں باقی ذمہ داری میری ہیں۔'' اختر نے کہا اور مرینہ نے آنکھیں بند کر لیں پھر اس کی آواز ابھری۔

''میں تمہاری ہوں اختر...... سمجھے میں تمہاری ہوں۔'' مرینہ کو خود بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ الفاظ اس انتقامی عمل کے نتیجے میں ہیں یا پھر ان کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے۔

☆......☆......☆

رب نواز نے گہری نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔

''کون ہے وہ؟''

''ایک تنہا لڑکی ڈیڈی جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

رب نواز کے چہرے پر عضلات میں ہلکا سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ بیٹا اس سے بہت زیادہ قریب نہیں تھا اور رب نواز اندھا بھی نہیں تھا۔ بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور غیر مطمئن نہیں تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بیٹا ان لوگوں میں سے نہیں جو آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ لیکن اس وقت اختر نواز کا جو لہجہ تھا وہ ذرا حیران کن تھا اس نے فوراً ہی اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''مالی حالت کیسی ہے اس کی؟''

''میرے لیے قابل قبول ہے۔'' اختر نواز نے یہ جواب بھی خلاف توقع دیا۔

''میں اپنی بات کر رہا ہوں اختر!''

''میں آپ کی شادی نہیں اپنی شادی کی بات کر رہا ہوں ڈیڈی۔ کہیں آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہو گئی۔'' اختر نواز کا یہ لہجہ بھی اجنبی تھا لیکن رب نواز نے اسے پی لیا اور مدھم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گستاخی اور مذاق میں فرق ہوتا ہے اختر سمجھ رہے ہو نا تم۔''

''جی ڈیڈی لیکن یہ نہ گستاخی ہے اور نہ مذاق۔ میری زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ ڈیڈی ہم دونوں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے اور میں اس امید کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ کی طرح مجھ سے تعاون کریں گے۔ میں اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسے باعزت طور پر اس گھرانے کے شایان شان رخصت کر کے یہاں لائیں۔''

''دیکھو! شہر میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے جس کے سرپرست نہ ہوں اور وہ مالی حیثیت میں بڑی ہو۔ مجھے صرف یہ تردّد ہے کہ آخر وہ ہے کون اور تم نے مجھے اس کے مالی حالات بھی نہیں بتائے۔ کم از کم اس کا صحیح تعارف تو کرا دو۔''

''ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتی ہے اور بہت مشکلات میں گزارہ کر رہی ہے۔ اس طرح کہ اس کے پاس کار بھی نہیں ہے اور ایسا کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں ہے

کہ وہ آسانی سے زندگی گزار سکے یہ ہے اس کی مالی حیثیت ڈیڈی۔''

''خوب اور تم اسے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو؟'' اس بار رب نواز کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی۔

''جی آپ کی دعاؤں کے ساتھ۔'' اختر نے جواب دیا۔

''یہ بد دعا میں تمہیں کبھی نہیں دے سکتا سمجھے۔ شہر کے کئی بڑے بڑے لوگ شاید تم انہیں جانتے ہو حاجی بھائی مانڈے والا اور رحمت اسٹیل مل والا اس کے علاوہ فیاض انڈسٹریز والے فیاض علی کو جانتے ہوگے یہ سب اشارتاً تمہارا تذکرہ کر چکے ہیں ان کی لڑکیاں خوبصورت بھی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی اور ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے نام کوئی مل فیکٹری یا بڑا کارخانہ نہ ہو اور تم سے شادی کے بعد یہ چیزیں تمہیں مل جائیں گی اور تم میرے مقابلے کے کاروباری بن جاؤ گے۔ ان لوگوں سے سودے بازی بھی کی جاسکتی ہے جو زیادہ بولی دے وہ اپنی بیٹی کو تم سے منسوب کر دے اور تم اس دولت کو چھوڑ کر ایک قلاش لڑکی کو اپنانا چاہتے ہو کیا تم اتنے ہی بے وقوف انسان ہو کہ تمہیں اپنا مستقبل عزیز نہیں ہے۔''

''وہ مجھے پسند ہے ڈیڈی۔''

''ہونہہ پتہ بتاؤ اس کا...... آج رات تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔'' رب نواز صاحب نے رعونت سے کہا اور اختر نواز تلملا کر رہ گیا۔

''ڈیڈی! میں نے آپ کو اس کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ آپ کو اپنے الفاظ واپس لینا ہوں گے وہ میری پسند ہے میرا مستقبل ہے اور آپ اپنے مزاج کی بات کر رہے ہیں۔''

''بیٹے کیا سمجھتے ہو تم کیا میں تمہاری جانب سے اتنا ناواقف ہوں۔ ایسے عمل میرے اور تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہوتے۔ کیا تمہارے خیال میں مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ میں نے کبھی تمہاری تفریحات میں مداخلت نہیں کی۔ صرف اس لئے کہ میں زندگی اور نوجوانی کی اُمنگوں کو قید کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ آخر تمہیں شادی کی سوجھی کیا ہے؟ جانتے ہو شادی دنیا کی سب سے بڑی

بے وقوفی ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے لئے قید خانہ تلاش کرنا ہے تو وہ شادی کر لے۔ ہاں جب دنیا کے ہنگاموں سے تھک جاؤ تو شادی کر لینا۔ کبھی کبھی انسان اپنے ہاتھوں اور پیروں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں دیکھنے کا شوقین ہوتا ہے مگر اس کے لئے جلدی کرنا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔'' رب نواز اپنی زبان بول رہا تھا لیکن اختر نواز نے کہا۔

''میں صرف شادی کرنا چاہتا ہوں ڈیڈی اور اسی لڑکی سے سمجھے آپ۔''

''میں اجازت نہیں دے سکتا۔'' رب نواز نے پتھریلے انداز میں کہا۔

''اس کے باوجود اگر میں اسے اپنا لوں؟'' اختر نواز نے سرکشی سے بولا۔

''تو پھر میں ان فلمی باپوں سے مختلف حرکات نہیں کروں گا جو ایسے موقع پر کرتے ہیں۔ میں تم سے کہہ دوں گا کہ جاؤ اس کے بعد اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا، میری دولت میں سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں ملے گی اور میں تم سے یہ بھی کہوں گا کہ اس گھر کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہوں گے جب بھی تمہیں اپنی اس حماقت کا احساس ہو جائے۔ چلے آنا کیا سمجھے؟'' ربنواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کچھ مذاق تو نہیں ہے ڈیڈی؟'' اختر نواز نے پوچھا۔

''اس شکل میں مذاق ہے کہ تم اس بات کا اعتراف کر لو کہ اب تک تم بھی مجھ سے مذاق ہی کرتے رہے ہو اور اگر تم نے یہ سب کچھ حقیقتاً کہا تو میں نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی حقیقت سمجھو۔

''گڈ تو پھر آیئے ڈیڈی ایک ایک کپ کافی ہو جائے۔ آخری کپ جو آپ کے ساتھ پیا جائے گا۔ اس کے بعد نجانے کب آپ کو یا مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو۔'' اختر نواز بھی آخر رب نواز کا بیٹا ہی تھا۔ اس نے بھی اسی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور رب نواز نے گردن ہلا دی۔

''ویری گڈ ویری گڈ۔ ملازم کو بلاؤ کافی کے لئے کہو یا یہ کام مجھے ہی سرانجام دینا پڑے گا۔''

''نہیں میں آج بھی آپ کا وفادار بیٹا ہوں ڈیڈی یہ تو ایک معاہدے والی بات ہے۔'' اختر نواز نے کہا اور ملازموں کو کافی لانے کی ہدایت کر دی جو تھوڑی دیر کے بعد

پہنچ گئی۔

''تھوڑی سی رقم تو مجھے مل سکے گی نا ڈیڈی۔ قرضِ حسنہ سمجھیں کسی بھی وقت واپس کر دوں گا۔'' اختر نواز بولا۔

''نہیں بیٹے یہ اصول کے خلاف بات ہوگی اور پھر ممکن ہے یہ رقم تمہیں ابتدائی سہارا دے دے۔ اگر قلاش ہوئے اور زندگی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے تو جلدی واپس آنے کی کوشش کرو گے۔ البتہ تم یہ بات یاد رکھنا کہ کسی بھی جعلسازی سے تم کہیں سے کوئی رقم نہیں لے سکو گے میں ایک محتاط آدمی ہوں اور دنیا کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ تمہارے سارے راستے بند کر دوں میں سارے انتظامات کر لوں گا سمجھے؟''

''جی ڈیڈی سمجھ رہا ہوں۔'' اختر نواز نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''ہاں ایک کام اگر مناسب سمجھو تو کر دو مجھے اس جگہ کا پتا بتا دو جہاں تم قیام کرو گے تاکہ اگر کبھی مجھے ہی تمہاری ضرورت پیش آئے تو میں تم سے رابطہ قائم کر سکوں۔''

''چال چل رہے ہیں ڈیڈی چال چل رہے ہیں تاکہ راتوں رات کوئی کاروائی ڈالیں مگر میں جھانسے میں نہیں آؤں گا آپ ہی کی اولاد ہوں۔'' اختر نے کافی کے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری مرضی ہے جیسا تم پسند کرو۔'' رب نواز صاحب نے شانے ہلائے کافی ختم ہوئی تو اختر اٹھ کھڑا ہوا۔

''جی سر اجازت......''

''ہاں بالکل جو کچھ تم چاہتے ہو ظاہر ہے میرے لئے ممکن نہیں ہے تو اس کے بعد تمہارے یہاں رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''جی جی میں سمجھ رہا ہوں۔'' اختر نواز واپسی کے لئے مڑا تو رب نواز صاحب کی آواز اُبھری۔

''کار کی چابی کہاں ہے؟''

''ڈرائیور کے پاس موجود ہے آپ نے مجھے چیلنج کیا ہے ڈیڈی اس لئے کچھ

نہیں لے جا رہا۔''

''ٹھیک ہے خدا حافظ!'' رب نواز نے کہا اور اختر کوٹھی سے نکل آیا۔ اس کے ہونٹ تشویش سے سکڑے ہوئے تھے۔ کافی غور کیا تھا اور اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا اور اس کے نتیجے پر بھی غور کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہی سب کچھ ہوتا ہے اور جو کچھ ہوا تھا اس کے لئے خلافِ توقع نہیں ہوا تھا۔ رب نواز سے اس کا اسی طرح کا رشتہ تھا اور وہ اس طرح کے انسان تھے۔ ان کی اپنی زندگی تھی جس میں سب کچھ موجود تھا۔ ان کے اپنے اس طرح کے عمل تھے کہ انہیں کسی اور کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ بہر حال اب اس کے بعد وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے قدم مرینہ کے فلیٹ کی جانب ہی بڑھ گئے تھے۔ البتہ اس نے اس بات کا خیال رکھا کہ رب نواز نے کسی کو اس کے تعاقب میں نہ بھیج دیا ہو۔ مرینہ کے فلیٹ کا حوالہ وہ کسی شکل میں دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

مرینہ کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے کسی قدر اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا جناب کہ صورت حال یہ شکل اختیار کر جائے گی۔ اب بتائیے کہ میں کیا کروں؟'' اس نے پریشان نگاہوں سے مرزا جمال بیگ کا چہرہ دیکھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مرزا جمال بیگ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ انہوں نے پُرمسرت انداز میں گردن ہلائی۔

''اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ میری نورِ نظر کہ تم اس قدر برق رفتاری سے کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہوئی یہاں تک آ جاؤ گی۔ بخدا تمہاری فطرت کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا تو تھا لیکن تم اپنے عمل میں اس قدر برق رفتاری اختیار کرو گی مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ اس عظیم الشان کامیابی پر میری طرف سے مبارکباد قبول کرو اور اس کے

ساتھ ہی یہ پُرمسرت دعا کہ خدا کرے مستقبل میں اختر نواز تمہارے لئے اچھا شوہر ثابت ہو۔'' مرینہ کا منہ حیرت سے کھل گیا اسے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ مرزا جمال بیگ اس بات پر خوشی کا اظہار کرے گا۔اس نے حیرت سے کہا۔

''تت......تو کیا جناب......تت......تو کیا......؟''

''ہاں مرینہ بیٹے! حیرت انگیز طور پر ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ویسے میں ایک سوال کروں تم سے۔اس کی عادات واطوار کے بارے میں تم نے کوئی اندازہ تو قائم کیا ہوگا؟''

''سر میں آپ کو ایک بات ضرور بتاؤں گی وہ یہ کہ اختر اتنا بُرا انسان نہیں ہے۔ میری اس سے ہر موضوع پر بات ہوئی ہے مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس کے پس منظر میں ایسا کوئی تصور میرے دل میں تھا، اصل میں اختر کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس کی ماں کی اتنی جلدی موت کی ذمے داری رب نواز کے عادات و اطوار پر ہے۔ باپ کو اور کچھ تو نہیں کہہ سکا وہ، لیکن اس نے باپ جیسی عادات و اطوار اختیار کر کے اپنی ماں کا انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔ باپ کی فطرت اور حرکتوں نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔حیرانی کی بات یہ کہ باپ بیٹے کے درمیان کوئی حجاب کوئی احترام نہیں ہے جس کا اندازہ مجھے اس گفتگو سے ہوا جو اختر نے مجھے سنائی ہے۔ان حالات میں اگر وہ غلط راستوں پر نکل آیا ہے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن آپ یقین کریں کہ اب ہر طرف سے ایک ہی بات سننے کو مل رہی ہے وہ یہ کہ ایک لڑکی کی محبت نے اختر نواز کو جانور سے انسان بنا دیا ہے۔''

''خدا کی قسم مرینہ! تم نے میرے روئیں روئیں کو خوشی بخشی ہے۔ اگر تمہارے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ ہے تو میری دلی دعا ہے کہ تم ایک خوش وخرم زندگی گزار لو بلاشبہ یہ ایک انوکھا انتقام ہوگا۔ہم وہ وحشی نہیں ہیں کہ کسی کی قتل و غارتگری کی خواہش کریں۔انسان کا جذباتی قتل سب سے بڑا انتقام ہوسکتا ہے کیا سمجھیں؟''

''تو پھر مجھے بتایئے میں کیا کروں؟''

''بیٹی اگر بُرا نہ مانو تو میں تم سے صرف ایک جملہ کہوں گا کہ تم اس سے شادی کر

لو۔جس قدر جلد ممکن ہو شادی کر لو۔ ویسے یہ بتانا پسند کرو گی کہ وہ خود کیا کہتا ہے؟''

''بہت شرمندہ ہو کر میرے پاس آیا ہے اور کہتا ہے کہ باپ کی دولت تو نہیں لا سکا لیکن مجھے کسی مشکل کا شکار نہیں رہنے دے گا۔وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم جلد از جلد شادی کر لیں۔''

''اور میں بھی چاہتا ہوں مرینہ۔ایک اور خیال میرے ذہن میں ہے وہ یہ کہ اگر اختر نے اپنے باپ کو تمہارے فلیٹ سے دور رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو پھر میرا ابھی تم سے مل بیٹھنا ضروری ہے لیکن اس طرح کہ اختر کو یہ شبہ نہ ہو۔ ظاہر ہے تم نے کسی عزیز کا تذکرہ اس سے نہیں کیا ہوگا۔''

''ہاں اس نے پوچھا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا ہی بتایا ہے۔''

''لیکن ہم ایک ترتیب کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ کسی شاہراہ پر اچانک میں تمہیں مل جاؤں اور تم چچا کہہ کر مجھے پہچان لو اور یوں ہماری ملاقاتیں شروع ہو جائیں گی۔ لیکن ابھی نہیں۔ پہلے تم اس کی ہدایت کے مطابق اس سے شادی کر لو۔ ایک ایک مضبوط قدم ہوگا اور اگر تم دونوں کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر رب نواز کے سارے منصوبے فیل ہو جائیں گے۔وہ کوئی ایسی رخنہ اندازی نہیں کر سکے گا جس سے تم دونوں کے درمیان جدائی ہو جائے۔کیا سمجھیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن چچا جان والی بات......''

''بھئی تمہارے والد کا ایک انتہائی گہرا دوست...... وہ دوست جس پر تمہارے والد صاحب نے بہت احسانات کئے تھے۔کیا سمجھیں ہم کوئی کہانی سنائیں گے۔''

''لیکن سر افسوس مجھے تو خود اپنے والد کے بارے میں کوئی کہانی معلوم نہیں۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''جی بہت بہتر۔''

''اور ہاں یہ تھوڑی سی رقم رکھ لو۔ بے شک اس کے باپ نے اسے کچھ قرض دینے سے بھی انکار کر دیا ہے لیکن تمہارے چچا نے تو نہیں۔شادی کے سلسلے میں بہت سی ضرورتیں پیش آئیں گی۔بس تم یہ سمجھ لو کہ ہم اپنے منصوبے پر خرچ کر رہے ہیں۔''

''ویسے بھی سر میری کفالت آپ ہی کر رہے ہیں۔'' مرینہ نے وہ بڑی رقم لے کر اپنے بیگ میں رکھ لی اور اس کے بعد واپس چل پڑی۔ جب وہ فلیٹ پر پہنچی تو اختر وہاں موجود نہیں تھا، کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا لیکن اس کا چہرہ مرجھایا ہوا سا تھا اور اس پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ وہ صوفے پر دراز ہو گیا۔

''یار مرینہ دنیا بڑی انوکھی جگہ ہے۔ سارے رشتے ناتے دوستی یاری مسخرہ پن ہے۔ ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کے گُر، اس کے لئے چاہے جیسے بھی الفاظ تراش لو، بڑا لطف آیا مرینہ دنیا کی ایک نئی شکل دیکھ کر۔'' اختر کے لہجے میں یاس تھی۔

''کیا ہوا اختر؟''

''مرینہ میں بے حد مطمئن تھا کہ تھوڑی سی رقم اپنے دوستوں سے قرض لے لوں گا اور اس وقت کے اخراجات پورے ہو جائیں گے لیکن میں نے کسی مکروفریب سے کام لئے بغیر انہیں ساری سچ سچ بتا دیا۔ کیا بات ہے کیا مزہ آیا انہیں دیکھ کر کہ ان لوگوں نے تو ایسے رنگ بدل لیا کہ شاید گرگٹ بھی اتنی جلدی اپنا رنگ نہ بدل سکے۔ یار اب تک میں ان فلمی کہانیوں کو بے ہودہ اور جھوٹ ہی سمجھتا تھا جس میں انسان کو اخلاق، مروت سے اس قدر گرا ہوا دکھایا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ فوراً نگاہ بدل لیتے ہیں۔ لیکن کمال ہے بھئی ایک ایک بات سچ نکلی، سب نے مجھے انگوٹھے دکھا دیئے۔''

''تو تم پیسوں کا بندوبست کرنے گئے تھے اختر؟''

''ہاں یار بس بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے۔''

''کیا تم نے یہ اچھا کیا ہے اختر؟'' مرینہ کا لہجہ سن کر اختر چونک پڑا۔

''کیا مطلب تمہارا؟''

''اختر تمہاری طرف سے مجھے پہلا دکھ پہنچا ہے۔''

''ارے باپ رے باپ کیا پیسوں کا بندوبست نہ ہونا تمہارے لیے تکلیف دہ ہے؟''

''ذلیل کرنا شروع کر دیا نا بیوی بنانے سے پہلے ہی۔''

''مرینہ پلیز میں اپنے آپ کو عقل کل نہیں کہتا۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے خدا کی

قسم مجھے اندازہ نہیں ہو پا رہا کیا غلطی ہے؟ کیا تم اس بات سے بددل ہو کہ میں تھوڑی سی رقم بھی نہیں جمع کر سکا جبکہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا تھا؟''

''نہیں اختر! میرا نظریہ ذرا مختلف ہے تم اتنے بڑے باپ کے بیٹے نہیں ہو جتنے بڑے تم خود ہو۔ تمہیں کیا ضرورت تھی دوستوں کے سامنے خود کو ہلکا کرنے کی۔ میرے پاس جو پیسے موجود ہیں وہ تمہارے نہیں تھے؟'' اختر نواز عجیب سی نگاہوں سے مرینہ کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''یار میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں نے ایسے نکموں کی بہت ساری کہانیاں سنی ہیں جو کسی سے دوستی کر لیتے ہیں اور پھر اس کے پیسوں پر گزارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر تم بیوی بننے والی ہو۔ ابھی سے سوچو گی کہ کیسے نکھٹو شوہر سے پالا پڑا ہے۔ شادی کے لئے پیسوں کا بندوبست نہیں کر سکتا، یار مرینہ میں، میں......''

''دیکھو اختر! جو کچھ کریں گے مل جل کے کریں گے۔ تم کسی بھی مسئلے میں تنہا نہیں ہو۔ البتہ تمہیں ایک وعدہ کرنا پڑے گا وہ یہ کہ کوئی مشکل تمہارے سامنے آتی ہے تو تم اس کے لئے مجھ سے مشورہ ضرور کرو گے۔ یہ رقم میں نکال کر لائی ہوں۔ اپنے بُرے وقت کے لئے میں نے جمع کر رکھی تھی۔ میں حالات سے بے خبر تو نہیں ہوں۔ ابھی ہم لوگ اس سے گزارہ کرتے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے، جو کچھ ہو گا مل جل کر ہی کریں گے۔''

اتنی بڑی رقم دیکھ کر اختر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''تم نے پہلے کبھی مجھے نہیں بتایا تھا کہ تمہارے پاس اتنی رقم کا بندوبست ہے۔''

''جناب اور بھی کچھ بہت ہے آپ جیسے شخص سے شادی کرنا کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔ چلیں اب ان باتوں کو ذہن سے نکال دیں ہم ایک شاندار پارٹی کا بندوبست بھی کریں گے۔''

''نہیں مرینہ! میں ان کتوں کو کھلانے کا شوقین نہیں ہوں جو اتنے خودغرض ہوں، مگر ایک شرط اور ہے تم سے میری۔''

''شرطوں پر شرطیں لگائے جا رہے ہو فرمایئے وہ کیا ہے؟''

”اس وقت جو کچھ تم کر رہی ہو وہ میرے اوپر قرض ہوگا، اگر ایک غیرت مند شوہر ہوں تو پائی پائی چکا دوں گا تمہاری یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”اور ایک بات میں بھی کہوں اختر صاحب میرے وجود کے ذرّے ذرّے پر آپ کا حق ہے آپ یہ قرض ضرور ادا کر دیجئے لیکن اپنی بھرپور محبت سے، مکمل اعتماد دے کر۔“ مرینہ نے کہا اور اختر کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”میں ان الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا مرینہ۔“

☆......☆......☆

بے حد سادگی سے دونوں کی شادی ہوگئی۔ حالانکہ مرینہ نے یہ سب کچھ انتقام کے طور پر کیا تھا۔ جمال بیگ کا جو بھی منصوبہ ہو اس کی پوری تفصیل تو کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بہرحال انسان تھی۔ سینے میں دل بھی تھا۔ دل میں آرزوئیں بھی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ماضی نے اسے جو کچھ دیا تھا اس نے اسے بہت سے احساسات سے دور کر دیا تھا لیکن اختر نواز کی قربتوں نے اور اس کے ساتھ منسوبیت نے اس کے دل کے بے شمار گوشے نرم کر دیئے تھے اور جب بات اس شادی تک آ گئی اور اس کی توقع کے برخلاف مرزا جمال بیگ نے اسے شادی کی اجازت دے دی تو وہ سرشار ہوگئی۔ مشکلات کا دور گزر گیا تھا۔ بہرحال شادی نہایت سادگی سے ہوئی، گواہوں کا بندوبست خود قاضی صاحب ہی نے کیا تھا۔ نکاح بھی قاضی کے گھر پر ہی ہوا تھا اور تھوڑی سی مٹھائی تقسیم ہوگئی تھی اور بس وہاں سے واپس فلیٹ میں آ گئے تھے اور پھر پورا ایک ہفتہ دونوں فلیٹ میں ہی بند رہے اور ایک ہفتے کے بعد کے پہلے روز مرینہ نے اسے کسی کام سے روانہ کیا۔ جب اختر چلا گیا تو اس نے جمال بیگ کو فون کیا۔

”میں......“

”میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں مرینہ بیٹی۔“ دوسری طرف سے مرزا جمال بیگ کی آواز سنائی دی۔

”سب کچھ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق کیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں بیٹا اور ایک بات کہوں کاش! تمہاری شادی میں اپنی پسند کے مطابق کرتا۔ دل مسوس کر میں نے یہ وقت گزارا ہے۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں رخصت کرتا، خیر چھوڑو ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ ویسے یہ بتاؤ کہ اس وقت اختر نواز کہاں ہے؟“

”ایک کام سے میں نے انہیں بھیج دیا ہے۔“

”تو پھر میں چاہتا ہوں کہ وہ پروگرام آج ہی کر لیا جائے۔ میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔“

”جیسے آپ پسند کریں۔“ مرینہ نے جواب دیا۔

”جگہ بتاتا ہوں شام کو پانچ بجے تمہیں وہاں پہنچنا ہے۔ میں تمہیں چہل قدمی کرتا ملوں گا باقی پروگرام کے بارے میں تمہاری ذہانت پر اعتبار کرتا ہوں۔“

”چچا جمال بیگ کیا کہتے ہیں آپ؟“

”ہاں بالکل مگر جمال بیگ نہیں حسن علی۔“

”اوہو سوری سوری۔“ مرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک......“ ”اور پھر ایک بات سن لو دلہنوں جیسے کپڑے پہن کر آنا ہوگا۔ میری آنکھیں تمہیں اس شکل میں دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔“

”عجیب سا لگے گا سر۔“

”اب بھی سر کہو گی؟“

”کیا کہوں؟“

”انکل۔“

”ٹھیک ہے۔“

”بہرحال باقی لباس وغیرہ کے سلسلے میں تم دیکھ لو۔ کسی بھی بات کے لئے میں

تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔‘‘

اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد اختر کی واپسی ہوئی۔ مرینہ نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

’’کھانے کا انتظام تو یقیناً ہو چکا ہوگا؟‘‘ اختر نے کہا۔

’’ہاں کیوں نہیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔‘‘

کھانے سے فراغت کے بعد اختر نے کہا۔’’میں آج کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’بھئی اب میں گھر والا ہوں کھانا پکانے کی چیزیں بھی خریدنا ہوں گی۔ مجھے سب کچھ لانا چاہیے۔‘‘

’’بالکل بالکل...... کیوں نہیں۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ آج شام کو نکلیں گے تھوڑی دیر تک سیر و سیاحت کریں گے اس کے بعد شاپنگ کر کے گھر لوٹ آئیں گے کیا خیال ہے؟‘‘

’’خادم اعتراض کی جرأت کر سکتا ہے لیکن رات کا کھانا......‘‘ اختر ایک دم خاموش ہو گیا۔

’’جی جی رات کا کھانا کیا کہنا چاہتے تھے آپ؟‘‘

’’مم...... میرا مطلب ہے گھر ہی آ کر کھائیں گے۔‘‘ اختر نے پھیکے انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور مرینہ اسے گھورنے لگی۔

’’سچ بولنا شرط ہے جناب! سچ بتائیے کیا کہہ رہے تھے؟‘‘ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

’’مرینہ ابھی تک فضول خیالات ذہن سے نہیں نکل سکے ہیں۔ اصل میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ رات کا کھانا کسی ہوٹل سے کھائیں گے لیکن یہ بالکل بیوقوفی کی بات ہے جس کا اپنا گھر ہو، خوبصورت بیوی ہو، مزے مزے کے کھانے بنانا جانتی ہو تو اسے بھلا ہوٹل میں کھانے کی کیا ضرورت ہے اچھا ایک مسئلہ اور حل کر دو۔‘‘

’’جی وہ بھی فرما دیجئے۔‘‘ مرینہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

’’بھئی اب مجھے مرد بننے دو۔ کہیں نوکری کرنا پڑے گی۔ بہت ضروری ہے ورنہ

مجھے یوں لگے گا جیسے میں...... میں نے میرا مطلب ہے یوں لگے گا جیسے میں ابھی بالغ نہیں ہوا ہوں۔ دیکھو نا مرد اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ عورت کا مکمل محافظ ہو۔ اسے اپنے قوت بازو کی کمائی۔ کھلائے میں خود کو ابھی نامکمل سمجھتا ہوں۔‘‘

’’خدا ہماری مدد کرے گا اختر یقیناً تمہیں یہ سب کچھ کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ تم ایک مکمل مرد ہو اور اپنی کوششوں میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے لیکن تھوڑا سا وقت تو ہمیں بھی دو یار کم از کم ایک آدھ مہینہ گزر جانے دو۔ ابھی میں تم سے جدا نہیں رہ سکتی کیا سمجھے؟‘‘

’’جی......!‘‘ اختر نواز نے گردن خم کر دی تھی۔

منصوبہ مکمل تھا۔ کئی جگہ گھومنے کے بعد لبرٹی کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک ہی کسی نے مرینہ کو پکارا اور مرینہ چونک کر رک گئی۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر آواز دینے والے کو تلاش کرنے لگیں اور پھر اس نے مرزا جمال کو دیکھا۔ مرزا جمال بیگ تیز قدموں سے مرینہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اختر نواز کی نگاہیں بھی اس بوڑھے شخص کی جانب اٹھ گئیں جو بے اختیارانہ انداز میں مرینہ کی جانب بڑھ رہا تھا تبھی مرینہ کی آواز ابھری۔

’’اوہ ڈیئر انکل...... انکل آپ، آپ یورپ سے کب واپس آئے؟ کیسے ہیں آپ انکل؟‘‘ مرینہ کے انداز میں بھی بے اختیاری تھی۔ بوڑھے نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

’’ٹھیک ہوں میری بیٹی تم کیسی ہو؟‘‘ اس نے مرینہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’آپ کب آ گئے ہیں چچا جان اور مجھے آپ کے بارے میں کوئی علم بھی نہیں ہے۔‘‘

’’مجھے تو یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا بیٹے بس ایک چھوٹا موٹا سا کاروبار کر لیا ہے یہیں پر۔‘‘

’’اور مجھے تلاش نہیں کیا آپ نے...... آیئے میں آپ کو اختر سے ملاؤں اختر! یہ

میرے چچا حسن علی ہیں۔ میرے والد کے بچپن کے دوست۔ انہوں نے مجھے گودوں
میں کھلایا ہے۔ بہت محبت کرتے تھے مجھ سے۔ اپنی بیٹی کی طرح ہی چاہتے تھے۔ بہت
عرصے بعد ملے ہیں۔''

''یہ کون ہیں مرینہ بیٹے؟'' جمال بیگ نے اختر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''چچا جان یہ میرے شوہر ہیں اختر نواز۔''

''ارے او ہو تو اتنی دور کیوں کھڑے ہیں یہ آؤ بھئی میرے سینے کا ایک حصہ
تمہارے لئے بھی خالی ہے۔ تم بھی میرے جگر کے ٹکڑے ہی ہو۔ خوب ملے بھئی تم
لوگ روح خوش ہوگئی۔'' جمال بیگ نے اختر نواز کو بھی گلے لگا لیا اور اختر کو نجانے کیا
محسوس ہوا۔ مرینہ کے کسی اتنے قریبی عزیز کو دیکھ کر اور مل کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔

''بھئی واہ، آؤ کہیں چل کر بیٹھیں تفصیل سے باتیں ہوں گی بلکہ تم لوگ آؤ
میرے ساتھ آؤ میرے ساتھ۔ تمہاری گاڑی کہاں ہے؟'' جمال بیگ نے اِدھر اُدھر
دیکھا۔ ساری کی ساری اداکاری چل رہی تھی۔ اختر نواز نروس سا ہوگیا لیکن مرینہ نے
فوراً ہی کہا۔

''ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے چچا جان۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ساتھ ہی چلیں گے آؤ انکار کی گنجائش نہیں ہے۔
میری بیٹی مجھے ملی ہے اور وہ بھی ایک داماد کے ساتھ۔ میں اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں
سنوں گا آ جاؤ۔'' اس خلوص سے کہا تھا انہوں نے کہ اختر نواز کیلئے بھی کہنے کو کچھ باقی
نہیں رہا تھا۔ بہرحال وہ ایک خوبصورت گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ راستے میں
جمال بیگ نے کہا۔

''ہاں تو اختر میاں کیا کرتے ہو۔ اپنا کاروبار ہے کوئی یا، ویسے جہاں تک میرا
تجربہ ہے یہ شکل وصورت کسی اچھے گھرانے کے چراغ لگتے ہیں، یقیناً ہوں گے۔ میری
بیٹی کسی ایسے ویسے شخص سے کبھی شادی نہیں کرسکتی۔''

مرزا جمال بیگ انہیں اپنے خوبصورت گھر میں لے گئے اور اس کے بعد خاطر و
مدارت کے انبار لگا دیئے گئے۔ وہ ان کے سامنے بچھ گئے تھے اور اختر نواز ان کے

خلوص کے بے حد متاثر ہوا تھا۔ خاصی بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوگیا۔ اختر نواز نے کہا۔

''آپ واقعی بہت نفیس انسان ہیں انکل ہم آپ کے شایان شان تو نہیں ہیں
لیکن آپ کی محبت یہ بتا رہی ہے کہ اب ہم بھی آپ سے دور نہیں رہ سکتے۔ اچھا آپ
یہ بتایئے اب آپ کب تشریف لا رہے ہیں ہمارے ہاں۔ ویسے آپ یقین کریں ہم
بڑے معمولی لوگ ہیں۔ مگر آپ کی محبت ہمیں بہت نے بہت بڑا بنا دیا ہے۔ آپ کے
مل جانے سے اتنی خوشی ہوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔''

''کب کا کیا مطلب اختر میاں اب میں تم لوگوں کے بغیر بھلا رہ سکتا ہوں۔ کل
ہی آ رہا ہوں تمہارے پاس۔ پتہ بتا دو اور بار بار یہ مت کہنا کہ ہم غریب ہیں یا امیر تم
جو کوئی بھی ہو میرے دل کے ٹکڑے ہو پتہ بتاؤ مجھے۔'' اور اختر نواز نے فلیٹ کا پتہ بتا
دیا۔ خاصی رات تک جمال بیگ نے انہیں نہیں آنے دیا تھا۔ پھر جب انہوں نے
واپسی کی اجازت مانگی تو جمال بیگ نے کہا۔

''ابھی نہیں ابھی دل نہیں بھرا۔'' بہرحال واپسی کے لئے تیار ہوئے۔ جمال
بیگ نے اپنے کاران کے حوالے کردی۔

فی الحال تو اسے ڈرائیور کے ساتھ لے جاؤ۔ بعد میں کچھ بندوبست ہو جائے
گا۔ فکر مت کرو۔'' اس کے بعد انہوں نے ان دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے لفافے
میں رکھ کر دیئے۔

''یہ بس سمجھ لو ایک رسمی سی کاروائی ہے غور مت کرنا۔''

بہرحال وہ وہاں سے چل پڑے۔ راستے میں اختر نواز نے کہا۔

''بھئی تمہارے چچا جان خوب ملے بہت ہی نفیس انسان ہیں بڑے مخلص لیکن
میں نے یہ محسوس کیا کہ اپنی شاندار کوٹھی میں وہ تنہا ہی ہیں۔''

''ہاں اختر انہوں نے شادی نہیں کی۔''

''کیوں؟''

''مجھے اتنی معلومات نہیں بس مخلص انسان ہیں بڑا پیار تھا میرے ابو کے اور ان
کے درمیان۔''

"ٹھیک لگتا ہے۔"

ڈرائیور نے انہیں ان کے فلیٹ پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے ڈرائیور کو اپنے فلیٹ کے بارے میں پوری تفصیل بتا دی تھی کیونکہ دوسرے دن جمال بیگ صاحب کو یہاں آنا تھا۔ بہرحال یہ سارا منصوبہ بڑی خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ منصوبے کے مطابق مرزا جمال کو یہاں پوری طرح گھل مل جانا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے اپنے منہ سے کہا۔

"مرینہ بیٹے! سیدھی سیدھی بات ہے تم بے شک یہاں اگر اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہی ہو تو رہو لیکن میرا اب یہاں سے نکلنا مشکل ہے میں تم لوگوں کو تنگ کرتا رہوں گا۔"

"چچا جان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم آپ کے بچے ہیں۔ جیسا آپ پسند کریں۔"

مرزا جمال بیگ نے اب ان لوگوں کی زندگی میں پوری طرح دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ شام کا کھانا وہ یہیں کھاتے تھے۔ فرمائشیں کر کے جاتے تھے اور خوب نخرے سے کھاتے تھے۔ گھر کے معاملات ان سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اختر نواز کی پوری کہانی ان کے علم میں لائی گئی تو انہوں نے مرغی کی ران چباتے ہوئے کہا۔

"بھلا یہ کوئی فکر کی بات ہے۔ تم دیکھ لینا اختر میاں رب نواز صاحب کو ناک رگڑنی پڑے گی ایک دن۔ کب تک عیاشی کریں گے اور پھر ان کی دولت پر تمہارا حق ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں درحقیقت تمہاری محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ مرتے دم تک تمہیں یاد نہیں کریں گے، کیونکہ جو کچھ ان کی فطرت میں ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا تم جانتے ہو، تمہیں فکر کس بات کی ہے؟ کوئی نوکری وکری نہیں کرو گے تم۔ بہت چھوٹا سا کاروبار ہے میرا تم چلاؤ اسے سب لے لو۔ میرا کون ہے اس دنیا میں کیا سمجھے؟"

مرزا جمال بیگ تو یہ الفاظ چھوڑ گئے تھے لیکن وہ رات اختر نواز کے لئے خاصی کٹھن تھی۔ واقعی اپنے باپ سے بخوبی واقف تھا۔ وہ ساری زندگی بیٹے کا نام نہیں لے

گا۔ چونکہ اس نے اپنی زندگی کے لئے بہت سے مشغلے اختیار کر رکھے تھے۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہیں۔ آخر میں ان کی اولاد ہوں۔ عجیب عجیب خیالات اس کے ذہن میں پکتے رہے۔ رب نواز صاحب کے لئے اس کے دل میں نفرت پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بعد جب جمال بیگ سے گفتگو ہوتی تو جمال بیگ انتہائی نامحسوس انداز میں اس نفرت کو اور ہوا دیتا۔ اختر نواز اپنے باپ کو ایک غاصب اور درندہ انسان سمجھنے لگا تھا۔ اکثر وہ جمال بیگ کے پاس ان کے دفتر چلا جاتا تھا اور ان کے درمیان اس موضوع پر گفتگو بھی ہوتی تھی۔ جمال بیگ نے ان لوگوں کے تمام اخراجات خود سنبھال لئے تھے۔ نت نئے طریقوں سے وہ ان کی مالی ضروریات پوری کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اختر نواز بے ضمیر نوجوان نہیں تھا۔ باپ کی تربیت میں اس کی زندگی کے کچھ سال جس انداز میں گزرے تھے، اب وہ ان سے بالکل مختلف ہو چکا تھا۔ اس نے کئی بار یہ بات کہی کہ وہ کوئی ملازمت کرنا چاہتا ہے لیکن مرزا جمال بیگ نے بڑے پیار سے کہا۔

"نہیں میری جان! جس شخص نے ساری زندگی راج ہی کیا ہو وہ کسی نوکری کو کیا کرے گا۔ میں تمہیں قتل نہیں ہونے دوں گا۔ تم میری بیٹی کے سہاگ ہو۔ مجھے منظور نہیں ہے کہ تم کہیں چند ہزار روپے کی نوکری کرو اور تمہاری شخصیت مسخ ہو کر رہ جائے۔ یہ کاروبار ہے۔ ابھی تھوڑے دن اور گزار لو میرے پاس جو کچھ ہے اگر تم اسے قبول کرو تو حاضر ہے۔ تم خود ہی تکلف کرتے ہو۔ کل تمہارے بچے ہوں گے ان کے لئے کوئی بہتر زندگی کا بندوبست کرنا ہو گا۔ بہرحال اس بات کو ذہن میں رکھ لو کہ آج نہیں تو کل تمہیں میرا یہ کاروبار سنبھالنا ہو گا۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرا اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار تمہارے مضبوط ہاتھوں سے بہتر حیثیت اختیار کر لے۔"

"میں یہ نہیں کر سکتا چچا جان یہ ناممکن ہے میرے لئے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ میری ملکیت نہیں ہے میری ملکیت پر کسی اور نے قبضہ کر رکھا ہے۔"

"تو بیٹے پھر اپنا حق حاصل کرو۔ مرد بن کر سامنے آؤ۔ اسے احساس دلا دو کہ وہ

غلط کر رہا ہے۔ وہ ایک غاصب ہے اور حق دار کی دولت اپنے اوپر خرچ کر رہا ہے۔ آخر وہ ہے کیا چیز؟''

''میں اب خود بھی یہی سوچ رہا ہوں چچا جان۔''

''کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بتاؤ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنے معاملات میں میری مداخلت پسند کرو؟'' مرزا جمال بیگ نے چالاکی سے کہا اور اختر نواز نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یہ بات نہیں ہے چچا جان میں...... میں آپ کو کیا بتاؤں؟''

''حالانکہ تمہیں مجھے سب کچھ بتانا چاہیے۔'' جمال بیگ نے کہا۔

☆......☆......☆

اختر نواز تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''میں ان سے ملوں گا۔ بات کروں گا ان سے اور اگر وہ مجھے میرا حق دینے پر آمادہ نہ ہوئے تو میں انہیں راستے سے ہٹا دوں گا۔ انہوں نے ساری زندگی عیش میں گزار دی۔ میں آپ کو ان کی گھناؤنی حرکتوں کے بارے میں کیا بتاؤں۔ وہ شخص انسانیت سے اتنا گر گیا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں آپ نے مجھے ہر پیشکش کر دی ہے لیکن میری مرینہ صرف میری وجہ سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ میں اسے بہت کچھ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک خود اس کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا ہوں۔'' اختر نواز کی آواز بھرا گئی۔

''اس وقت کیا کرو گے تم اگر رب نواز نہ مانا بولو قتل کر دو گے اسے؟''

''شاید ایسا بھی کر گزروں۔''

''اور پھر جیل چلے جاؤ گے۔ پھانسی پر لٹک جاؤ گے۔ کیوں یہ سب نوجوانی کی ناتجربے کار باتیں ہیں۔ اگر اس حد تک آگے بڑھنے کی ہمت ہے تو ذہانت سے کام لو۔ میں تمہیں ایک پلان بتا سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم میری ہدایت پر کام کر لو تو بہت کچھ مل جائے گا تمہیں۔''

''میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک جب تم...... معاف کرنا رب نواز کو قتل تک کرنے پر آمادہ ہو تو میرا منصوبہ بہت بہتر ہے۔'' اس بات سے اختر نواز نے گردن جھکا لی تھی۔

رب نواز نے چونک کر اختر نواز کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆......☆

''کیسے ہیں آپ ڈیڈی؟اختر نواز نے آہستہ سے کہا۔

''تم خود دیکھ سکتے ہو تندرست وتوانا ہوں محسوس نہیں کر رہے؟''

''ہاں ڈیڈی لیکن آپ نے دیکھا میرے صحت کافی گر گئی ہے۔''

''کہو کیسے آئے؟''رب نواز نے اجنبی لہجے میں کہا۔

''شکست مان لی ہے ڈیڈی، آپ کے پاس واپس آ گیا ہوں۔''

''بیوی کہاں ہے تمہاری؟''

''چھوڑ دیا ہے اسے۔''

''تم نے یا اس نے؟''رب نواز صاحب حقارت سے بولے۔

''میں نے ڈیڈی۔''

''تمہیں اپنی ناکارہ شخصیت کا احساس ہو گیا ہوگا۔خیر چھوڑو مجھ ـــ یہ چاہتے ہو؟''

''آپ میری واپسی سے خوش نہیں ہوئے۔''

''بالکل نہیں۔ میں دوسرے قسم کا انسان ہوں اور پھر پہلے بھی میں تمہارا عادی نہیں تھا۔تم چلے گئے تو ایک بار بھی مجھے یاد نہیں آئے۔یقین کرو تمہاری ماں کو میں اس کی موت کے چند گھنٹوں کے بعد ہی بھول گیا تھا۔میں وقت کا کامیاب ترین انسان ہوں اور صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہوں۔''

''مگر میں آپ کا بیٹا ہوں ڈیڈی آپ کی اولاد۔''

صرف اس لئے کہ میری بیوی کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔تمہاری پیدائش نہ میری ضرورت تھی نہ خوشی اور اب بھی تم میری ضرورت نہیں ہو۔ میں اپنی ذات میں مکمل ہوں۔''اختر نواز نے آنکھیں بند کر لیں اس سے زیادہ اور کیا سن سکتا تھا۔یہ حقارت آمیز سلوک کی انتہا تھی۔رب نواز کی آواز ابھری۔

''خیر آ گئے ہو تو پہلے جیسی حیثیت تو کبھی نہیں حاصل کر سکتے۔ مجھے لوٹ کر آنے والوں سے نفرت ہے۔ پھر بھی مجھے تمہارا باپ کہا جاتا ہے۔ میں تمہیں اپنی کوٹھی میں ایک معمولی زندگی دے سکتا ہوں۔جاؤ اندر جاؤ۔''

اختر سست قدموں سے اندر چلا گیا تھا۔ بہر حال اختر نواز اپنے عزم میں اور پختہ

ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے اسے زمین کا بوجھ قرار دے دیا تھا، کسی بھی طرح قابل رحم نہیں تھا اور پھر ایک شام اس نے پہلا انجکشن رب نواز کی شراب کی مہر بند بوتل میں داخل کر دیا۔یہ انجکشن اسے جمال بیگ نے فراہم کیئے تھے اور اس شام یہی بوتل رب نواز کے سامنے پہنچی تھی اور دوسری صبح وہ بیمار ہو گیا تھا۔اسے شدید اعصابی کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔بہر حال ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور انجکشنوں کا پورا کورس اس کے لئے لکھ دیا۔ اختر نواز ہر معاملے میں پیش پیش تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ رب نواز اپنی بیماری پر جھلا گیا ہے۔زندگی میں دو چار بار ہی بیمار ہوا ہوگا اس لئے بیماری کا عادی نہیں تھا۔پھر طبیعت کئی دن تک ٹھیک نہیں ہوئی تو اس نے چڑچڑے لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

''آج تین دن گزر گئے ہیں ڈاکٹر اور مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا یہ کیا بات ہے؟''

''اصل میں مسٹر رب نواز اب آپ کی عمر اس مشقت کی اہل نہیں ہے جو آپ کرتے ہیں۔جوانی بہت پیچھے رہ گئی ہے آپ کو اپنے معمولات میں تبدیلی کرنی چاہیے۔''

''گویا آپ مجھے مر جانے کا مشورہ دے رہے ہیں؟''

''نہیں جینے کا مشورہ دے رہا ہوں۔''

''فضول باتیں ہیں زندگی کے لوازمات کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بے معنی رہ جاتا ہے۔میرا خیال ہے مجھے علاج کے لئے ملک سے باہر جانا ہوگا۔''

''جیسا آپ پسند کریں۔ ویسے دو تین دن میں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔لیکن اس کے بعد آپ کو احتیاط رکھنی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔''رب نواز نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔اسے ڈاکٹر کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔جب ڈاکٹر چلا گیا تو وہ دیر تک ڈاکٹر کو برا بھلا کہتا رہا۔روا روی میں اس نے اختر نواز سے کہا۔

''کیا کہتے ہو تم اس بکواس کے بارے میں جو ڈاکٹر نے کی ہے؟''

''انتہائی لغو اور بے ہودہ گفتگو کی ہے اس نے۔ میں اس سے ذرا بھی اتفاق نہیں کرتا۔ زندگی تعیش کے لئے ہے اور اگر زندگی سے عیش نکل جائیں ڈیڈی تو زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔''

"جی خوش کر دیا تم نے پہلی بار میرا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر خود بوڑھا ہو گیا ہے اور اب اس نے علاج کے بجائے نیکیوں کی تلقین کا کاروبار شروع کر دیا۔" رب نواز نے کہا۔

"آپ یہ کورس پورا کر لیں، اگر اس سے آپ کی حالت بہتر نہ ہوئی تو پھر یورپ چلیں گے۔" اختر نواز نے کہا۔

"یورپ کی رنگین فضائیں تو یوں بھی صحت بخش ہوتی ہیں لیکن کچھ کاروباری امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے ملک سے آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔" رب نواز نے کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں انجکشن کا وقت ہو گیا ہے لایئے آپ کو انجکشن دے دوں۔" اختر نواز نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ انجکشنوں کے بکس سے اس نے ایک انجکشن نکالا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے دوسرا انجکشن نکال کر اس دوسرے انجکشن کی دوا اس نے سرنج میں لی اور ڈاکٹر کے بتائے ہوئے انجکشن کو توڑ کر اس کی دوا فلیش میں بہا دی۔ اس کے بعد وہ سرنج لئے دوبارہ رب نواز کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اور دوا ان کے بازو میں انجیکٹ کر دی۔ رب نواز صاحب آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کے پورے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور وہ ہذیان بکنے لگے۔ گھر کے نوکر سہمے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ طلب کر لیا گیا اور اس وقت ان کی آمد پر جلتی پر تیل ثابت ہوئی۔ رب نواز ڈاکٹر پر الٹ پڑا۔

"تم ڈاکٹر ہو کہ گھسیارے۔ نکل جاؤ یہاں سے گیٹ آؤٹ آئندہ اس کوٹھی میں قدم نہ رکھنا۔" وہ ڈاکٹر صاحب پر جھپٹ پڑے اور ڈاکٹر صاحب کو جاتے ہی بن پڑی اختر نواز انہیں باہر چھوڑنے آیا تھا اس نے کہا۔

"سوری ڈاکٹر صاحب دراصل آپ نے ان سے جو کچھ کہا تھا وہ انہیں پسند نہیں آیا تھا۔"

"ایک معالج کی حیثیت سے میں نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک کہا تھا اگر یہ سب کچھ جاری رہا تو میں علاج نہ جاری رکھ سکوں گا، آپ کسی دوسرے ڈاکٹر سے رجوع

کریں۔" ڈاکٹر صاحب نے ناگواری سے کہا اور چلے گئے۔

اختر نواز کا چہرہ پر سکون تھا۔ بہرحال رب نواز صاحب کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ اب انہیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دورے پڑنے لگے تھے اور وہ بہت کم ہوش میں رہتے تھے۔ اختر نواز ان کی ضرورت پر انہیں شراب مہیا کر دیتا تھا۔ اور شراب پینے سے وہ کسی قدر پرسکون ہو جاتے تھے۔ ان کے شناسا عیادت کو آتے تو وہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اختر نواز خود انہیں رسیو کرتا، تمام کاروباری معاملات بھی اُلجھنے لگے تھے۔

منیجر کی درخواست پر اختر نواز نے خود کاروباری امور سنبھال لیے۔ کوئی دقت نہیں پیش آئی تھی۔ آخر وہ بھی انہی کی اولاد تھا، کسی کو اس سے رجوع کرتے ہوئے اعتراض نہیں ہوا اور رفتہ رفتہ سارے کاروباری امور اس نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ وہ باقاعدہ دفتر میں وقت دینے لگا اور اس نے تمام بگڑے ہوئے معاملات سنبھال لئے۔ جبکہ ادھر رب نواز صاحب قطعی معطل ہو گئے تھے، ان کے اعصاب بیکار ہو گئے تھے۔ دن کا قلیل حصہ ایسا ہوتا جب وہ صحیح الدماغ ہوتے ورنہ دورے کے عالم میں رہتے اور بعض اوقات تو ملازموں کے لئے دردسر بن جاتے۔ پھر ایک دن اختر نواز نے مرزا جمال بیگ سے ملاقات کی۔ جمال بیگ نے بڑے پُر جوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔ اختر نواز نے کہا۔

"میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا ہوں چچا جان۔"

"مجھے علم ہے بیٹے میں ان معاملات سے بے خبر تو نہیں رہا۔"

"لیکن اب مرینہ سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا۔"

"تو اس کی ضرورت بھی کیا ہے، اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جاؤ تاکہ وہ اپنا گھر سنبھال لے۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں چچا جان اور اس وقت اسی مشورے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"آج ہی نہیں بلکہ ابھی مرینہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چلو میں ساتھ چلتا ہوں۔" جمال بیگ نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اختر نواز کی لمبی اور حسین کار اس

فلیٹ کے سامنے رک گئی جس میں مرینہ اب رہتی تھی۔ جس وقت وہ دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے تو مرینہ کے پاس دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ شکل وصورت سے وہ کسی قدر پسماندہ لگتی تھیں۔

''اوہو خالہ جان دیکھئے اختر آ گئے۔ آیئے میں آپ کو ان سے ملاؤں۔ اختر یہ میری خالہ ہیں اور یہ ان کی نند......اور خالہ یہ میرے شوہر اختر نواز ہیں اور یہ ان کے چچا۔''

خالہ بیچاری غیر مردوں کے سامنے شرما رہی تھیں گردن ہلا کر رہ گئیں۔ البتہ انہوں نے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اختر نواز کے دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹے ہم غریب لوگ ہیں لیکن یہ ہماری ریت ہے تم ہمارے داماد ہو اور انتہائی خوش نصیب ہو کہ تمہیں مرینہ جیسی صاحب کردار بیوی ملی۔ یہ بچی ہمارے سامنے جوان ہوئی ہے اور ہم اس کی مثال دیتے ہیں اپنی بیٹیوں کو۔ اچھا مرینہ بیٹی اب اجازت دو۔'' اختر نواز نے بڑے احترام سے وہ نوٹ قبول کر لیا۔ پھر اس نے مرینہ سے کہا۔

''مرینہ! خالہ جان کی کچھ خدمت بھی کی ہے؟''

''ہاں میں چائے پلا چکی ہوں بہت ضد کر رہی ہوں خالہ کھانا کھا کر جائیں یہ نہیں مان رہی ہیں۔''

''پھر کبھی آؤں گی بیٹی اس وقت تو ضروری کام سے گھر سے نکلی تھی کہ راستے میں تم مل گئی۔ پھر کبھی ضرور آؤں گی۔'' خالہ نے کہا اور پھر دونوں خواتین چلی گئیں۔

''خالہ ہماری پرانی شناسا ہیں آج راستے میں مل گئی تھیں۔'' ان کے جانے کے بعد مرینہ نے کہا۔

''اچھا ہے عزیزوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے لیکن آپ نے بیچاری خالہ کو غلط گھر دکھا دیا اب اگر وہ دوبارہ آئیں تو پریشان ہوں گی۔'' اختر نواز نے کہا۔

''کیوں؟'' مرینہ نے کچھ نہ سمجھ کر کہا۔

''مطلب یہ خاتون کہ کب تک میکے میں پڑی رہیں گی آپ۔ سسرال چلنے کی تیاریاں فرمایئے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' اختر نواز نے کہا اور مرینہ عجیب سے احساسات میں کھو گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ جذباتی سے تاثرات نظر آنے لگے۔ اسی

وقت مرزا جمال بیگ بول پڑے۔

''تیاریاں کرو مرینہ۔ وہاں جا کر تمہیں بڑی ذمہ داریاں سنبھالنا ہیں۔ بہت سی اہم ذمے داریاں ہیں۔ اتنی بڑی کوٹھی اور بیمار سسر بھی وہاں موجود ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ میرے باہر جانے سے قبل تم اپنے گھر جا رہی ہو۔''

''باہر جانے سے قبل۔'' اختر نواز نے چونک کر کہا۔

''ہاں میں چند ماہ کے لئے مشرق وسطیٰ جا رہا ہوں کچھ کاروباری امور ہیں۔''

''کب جا رہے ہیں چچا جان آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا؟''

''بس کسی بھی دن کسی بھی وقت لیکن دورہ طویل نہیں ہوگا امکان ہے کہ جلد واپسی ہو جائے گی۔'' مرزا جمال بیگ نے کہا۔ مرینہ ان کی ہدایت سمجھ گئی تھی اس لئے تیاریاں کرنے لگی۔

''ویسے اختر میاں نوکروں وغیرہ کو تو مرینہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی، کیا انہیں اس بات کا علم ہے کہ تم نے رب نواز صاحب سے کہہ کر دوبارہ رابطہ قائم کیا ہے؟'' مرزا جمال بیگ نے پوچھا۔

نہیں چچا! ڈیڈی دوسرے قسم کے آدمی ہیں قطعی غیر جذباتی، وہ نوکروں کو صرف نوکر سمجھتے ہیں اور نہیں ذاتی معاملات میں کبھی شامل نہیں کرتے۔''

''چلو رب نواز کی کوئی خوبی تو ہمارے کام آئی۔ میں نے البتہ انہیں خود سے واقف رکھا ہے وہ سب جانتے ہیں کہ میں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اس لئے وہ مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ لیکن اب وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ میں اپنی بیوی اس کوٹھی میں لے آؤں۔''

''ونڈرفل، ونڈرفل اسے کہتے ہیں لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔'' مرزا جمال بیگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

رب نواز کو اب صرف کوٹھی کے ایک حصے میں محصور کر دیا گیا تھا۔ وہ نیم پاگل ہو

گئے تھے۔صرف چند ملازم ان کی خبر گیری کرتے تھے۔انہیں ہر آسائش مہیا کی تھی لیکن انہیں کوٹھی کے دوسرے حصے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔اکثر وہ جب دورے کی کیفیت میں نہ ہوتے اور خود پر غور کرتے تو ان پر جنون طاری ہونے لگتا تھا۔اپنی بے بسی پر وہ سر کے بال نوچتے تھے۔ساری زندگی حکمران رہے تھے۔تقدیر گر رہے تھے لیکن اب خود تقدیر کا شکار تھے۔اپنی بے بسی ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔وہ جانتے تھے کہ ان کا سارا کاروبار ان کے سارے اختیارات اختر نواز کے پاس جا چکے ہیں اور وہ ہر سیاہ سفید کا مالک بن گیا ہے۔ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور گرج کر اختر نواز سے بولے۔

"تم نے کس استحقاق پر کاروبار اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔مجھے دفتر لے چلو اور تمام کاروباری امور کے بارے میں بتاؤ۔سارے حسابات مجھے دو۔"

"ان تمام چیزوں سے اب آپ کو کوئی سروکار نہیں ہے ڈیڈی۔آپ شدید اعصابی امراض کا شکار ہیں۔ذرا سی بے احتیاطی آپ کی جان لے سکتی ہے اور پھر کاروبار تو آپ کا ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔"

"میری زندگی میں تو یہ نہیں ہو سکتا۔نہ ہی میں نے کوئی وصیت لکھی ہے۔"

"آپ کی زندگی اب ہے ہی کتنی ڈیڈی؟ بس تھوڑے سے سانس ہیں جو چل رہے ہیں اور وصیت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔میں آپ کی واحد اولاد ہوں آپ کے بعد سب کچھ قانوناً میرا ہی تو ہے۔"

"میری زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔"

"میں نے عرض کیا نا ڈیڈی آپ کی زندگی تو بس میری ایک جنبش ختم کر سکتی ہے۔کان دبا کر پڑے رہیے ورنہ یہ چند سانسیں بھی کھو بیٹھیں گے۔"

"میں تجھے جان سے مار دوں گا ناہنجار کمینے! یہ تُو مجھے اولاد ہونے کا صلہ دے رہا ہے۔"

"جو کچھ آپ نے باپ بن کر دیا ہے مجھے ڈیڈی وہی لوٹا رہا ہوں۔کیا سمجھے آپ ویسے آپ کے لئے مزید کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔"

اور پھر وہ بندوبست بھی ہو گیا، ربنواز کو کچھ اور محدود کر دیا گیا۔کوٹھی کے حالات اب ان کے علم میں نہ رہے تھے۔زیادہ سے زیادہ ان کی پہنچ کوٹھی کے عقبی باغ تک تھی لیکن وہاں بھی ان کی نگرانی ہوتی تھی اور اس شام وہ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ ان کی نگاہ ایک خوبصورت لڑکی پر پڑی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔انہوں نے سوچا کہ آہ زندگی سے کتنی دور جا چکا ہوں۔یہ حسین پیکر جو میرے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔اب انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔وہ اٹھے اور لڑکی کے قریب پہنچ گئے۔خوبصورت لڑکی عجیب سی نگاہوں سے رب نواز صاحب کو دیکھ رہی تھی۔اچانک ہی رب نواز صاحب کو محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کی شکل جانی پہچانی ہو۔انہوں نے بہت قریب جا کر اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے۔

"ہیلو"

"ہیلو رب نواز صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"کون ہو تم میں نے پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھا ہے یقیناً تم میرے بیٹے کی دوست ہو میں نے تمہیں کہاں دیکھا ہے؟"

"مجھے پہچانیے۔رب نواز صاحب ورنہ تسلیم کیجئے کہ آپ مکمل طور پر پاگل ہو چکے ہیں۔" لڑکی کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔رب نواز صاحب غصے سے سرخ ہو گئے۔

"تم میری کوٹھی میں آ کر مجھ سے بدتمیزی کر رہی ہو اس کا نتیجہ تم جانتی ہو۔"

"آہ...... آپ واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔اب یہ آپ کی کوٹھی کہاں رہی ہے اور پہلے واقعی لوگوں کو سزا دے لیا کرتے تھے لیکن اب تو آپ ان تمام سزاؤں کی سزا بھگت رہے ہیں۔آپ کی بینائی، آپ کی یادداشت بوڑھی ہو چکی ہے۔آپ مجھے پہچانتے، ذرا غور کریں، میرا نام مرینہ ہے، آپ کے دفتر میں ملازمت کرنے آئی تھی اور آپ نے میری مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر میری عزت خریدنے کی کوشش کی تھی اور جب میں نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تھا تو آپ نے اپنے اختیارات سے کام لے کر مجھے جیل بھجوا دیا تھا۔یاد ہے آپ کو۔"

رب نواز صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے پھر ان کے حلق سے

غراہٹ سی نکلی۔

''ہاں میں نے تمہیں پہچان لیا ہے لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کیا اب تم میرے بیٹے کی دوست ہو؟''

''بہت گہری دوست زندگی بھر کی دوست۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ رب نواز صاحب آپ کی بہو ہوں میں۔'' مرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور رب نواز پر جیسے بجلی گر پڑی۔

''کک...... کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''ہاں لمبی کہانی ہے۔ جب میں جیل سے نکلی تو اس پوری دنیا میں تنہا تھی۔ میری ماں مر چکی تھی اور ایک ایسے شخص نے مجھے سہارا دیا جو مجھ سے زیادہ آپ کے مظالم کا شکار تھا۔ اس کی مدد سے میں نے آپ کے بیٹے سے دوستی کی اور آخر کار اس نے مجھ سے شادی کر لی جس پر آپ نے اسے گھر سے نکال دیا لیکن انتقام پورا تو نہیں ہوتا تھا اتنی سی بات سے۔ مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ آپ کی فرعونیت کو شکست دینی تھی۔ آپ کا بیٹا دوبارہ آپ کے پاس پہنچا اور پھر اس نے آپ سے حق چھین لیا اور اس کے بعد اس نے خود آپ کو ایسے انجکشن دے کر مفلوج کر دیا جو اعضاء کو کمزور کرتے ہیں اور دماغی خلیے خشک کر کے جنون کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور محترم رب نواز صاحب عزتوں کو خریدنے والے، آبروؤں کے سودے کرنے والے اب آپ ایک دیوانے انسان ہیں پاگل اور مریض تھو......'' مرینہ نے زمین پر تھوک دیا، پھر بولی۔

''میرا انتقام ہے آپ سے۔ آپ نے مجھ سے میری آزادی چھینی تھی، میری ماں چھینی تھی، میں نے آپ سے آپ کے نجانے کتنے سال چھین لئے ہیں اور اب آپ ایک مفلوج اور پاگل انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اس کوٹھی اور آپ کی ساری جائداد کی ملک ہوں اور آپ کا بیٹا میرا غلام ہے سمجھ گئے نا آپ۔''

''تُو بکواس کرتی ہے کتیا یہ نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے تجھے قتل کر دوں گا۔'' رب نواز صاحب نے مرینہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن ملازموں نے دوڑ کر انہیں پکڑ لیا۔

''چھوڑ دو مجھے ذلیل کمینو! مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میری دشمن ہے۔ میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے ساری زندگی اپنے دشمنوں کو نیچا دکھایا ہے۔'' وہ چیختے رہے اور ملازم گھسیٹتے ہوئے انہیں ان کی قیام گاہ تک لے گئے اور پھر انہیں ان کے کمرے میں بند کر دیا۔ یہ ساری باتیں جب اختر نواز کو معلوم ہوئیں تو وہ سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مرینہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''سوری مرینہ تمہیں پریشانی ہوئی میرا خیال ہے میں اب انہیں کسی دماغی ہسپتال میں داخل کرا دیتا ہوں یہاں وہ خطرہ بن سکتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہ کرو میں آئندہ خود خیال رکھوں گی۔''

''مگر میں عاجز آ چکا ہوں دل چاہتا ہے زہر دے دوں انہیں۔''

''نہیں اختر نہیں۔'' مرینہ لرز گئی۔

''آئندہ ایسی بات مت سوچنا تم بے فکر رہو آئندہ اس کی نوبت نہیں آنے پائے گی، میں خیال رکھوں گی۔''

وہ اختر کے ہاتھوں قتل نہیں کرانا چاہتی تھی اور پھر انسانیت کی اس قدر تذلیل کرانا اسے پسند نہیں تھی۔ رب نواز کے لئے بس یہی کافی تھا کہ وہ بے بسی سے تڑپتا رہے۔ اگر وہ اس کی ماں کا قاتل نہ ہوتا اور اس کی ماں مر نہ گئی ہوتی تو وہ کبھی بھی اس قدر سنگدلی کا اظہار نہ کرتی۔

لیکن دوسری طرف رب نواز کے ذہن میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ اسے یہ سب کچھ سوچ سوچ کر دیوانگی کی سی کیفیت کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ مرینہ غریب گھرانے کی معمولی سی لڑکی جس نے اس کی بے عزتی کی تو اس نے مرینہ کی ساری زندگی برباد کر دی لیکن اب وہ اس کے مقابلے پر ہے اور اسے شکست دے چکی ہے اور اسے اس حالت میں پہنچانے والا اس کا اپنا بیٹا ہے۔ میرا اپنا بیٹا۔ آہ! مجھے شکست ہو چکی ہے اور میں واقعی بے بس انسان ہوں۔ مجھے میرے ہی ہتھیار سے مارا گیا ہے۔

پہلی بار رب نواز کو اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ اسے اپنی شکست خوردگی اور بے بسی پر سخت رنج ہو رہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اپنی

معمولی سی دشمن کے ہاتھوں اسے شکست نہیں ہونی چاہیے۔ اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں سے نکل جانا چاہیے اور یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہو گیا اور ایک رات جب نوکر اس کی دماغی حالت سے مطمئن ہو کر آرام کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے کوٹھی کے ایک عقبی باغ کی باڑھ پھلانگی۔ احاطے کے پاس پہنچا اور دوسری طرف کود گیا۔ وہ اس خطرناک مقام سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے اعضاء واقعی کمزور ہو چکے تھے۔ دوڑنے کی کوشش کی تو پھیپڑے پھول گئے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ تھوڑی دور چل کر وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اعضاء بالکل ہی بے جان ہو گئے تھے۔ شہر کا رئیس اعظم ایک اشارے پر لوگوں کو زندگی سے محروم کر دینے والا ایک گندی سی نالی کے قریب نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اسے گہری نیند آ گئی تھی اور صبح کو جب جاگا تو مکمل دورے کی کیفیت میں تھا اور لوگ اس کے گرد جمع تھے۔

''مرگی کا دورہ ہے شاید جوتا سنگھاؤ، ہاں ہاں جوتا سنگھاؤ۔'' لوگ تبصرے کرنے لگے۔ ایک ہمدرد نے جوتا اتار کر رب نواز کی ناک پر رکھ دیا۔ اس بار دورے کی حالت کچھ طویل ہو گئی تھی، وہ پاگلوں کی طرح سڑک پر مارا مارا پھرتا رہا۔ معدے میں کچھ نہیں تھا۔ قویٰ بھی جواب دیتے جا رہے تھے۔ صورت بگڑ کر رہ گئی تھی۔ لباس غلیظ ہو چکا تھا۔ اس حالت میں اسے ہوش آ گیا۔ لیکن ہوش و حواس کی یہ کیفیت اور بھی جان لیوا تھی اپنے بارے میں سوچتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ پوری زندگی کی داستانیں یاد آ رہی تھیں اور دل میں ایک احساس جاگ رہا تھا۔ یہ احساس ہر دل میں جاگتا ہے لیکن افسوس دیر ہو چکی ہے۔ اگر وقت سے پہلے یہ احساس جاگ جائے تو پھر توبہ کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ لیکن اب اسے صرف گناہوں کی سزا مل رہی تھی۔ بڑی پرانی پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک ایک لمحہ ذہن میں گردش کر رہا تھا اور یہ خیالات مزید بے چین کر رہے تھے۔ اس سے بہتر تو دیوانگی ہے۔ اپنے قویٰ بھی بے قابو ہو گئے تھے۔ آنکھیں کوشش کے باوجود نہیں کھل رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ زبان بھی خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی، کسی کے

بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ البتہ حالت کچھ بہتر محسوس ہوئی تھی۔ بھوک کی کیفیت بھی نہیں تھی اور بدن کے نیچے کھردری زمین کے بجائے آرام دہ بستر تھا۔ ایک بار پھر ایک ہلکی سی غشی جیسی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے بہت سی کیفیتوں سے آزاد کر دیا۔

دوسری بار جاگے تو بدن بہت ہلکا پھلکا تھا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام نہیں رہی اور پہلی بار کسی قدر بہتر حالت میں انہوں نے اس بدلے ہوئے ماحول کو دیکھا۔ درمیانے درجے کے فرنیچر سے آراستہ ایک کمرہ تھا جو کسی ہسپتال کا کمرہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ پھر یہ کونسی جگہ ہے ان کی اپنی کوٹھی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ دیر تک اپنی جگہ لیٹے سوچتے رہے۔ پھر دروازے کھلنے کی آواز سنائی دی، پھر ڈاکٹر نظر آیا جسے انہوں نے اس کے لباس سے پہچانا تھا۔ نوجوان ڈاکٹر مسکراتا ہوا ان کے پاس آ بیٹھا۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے جناب؟''

''ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر! کیا یہ کوئی پرائیویٹ ہسپتال ہے یا سرکاری مجھے یہاں کون لایا تھا؟''

''یہ ساری باتیں آپ کو بعد میں معلوم ہو جائیں گی، ذرا زبان دکھائیے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور رب نواز صاحب نے زبان باہر نکال دی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا معائنہ کر کے بیک وقت دو انجکشن دیئے اور بولے۔

''آپ یہ نشہ آور دوا کب سے استعمال کر رہے ہیں؟''

''نشہ آور؟''

''ہاں اس کا نام ایگزومائن ہے۔ انتہائی خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ یہ ویسے تو یہ نشے کے لئے استعمال نہیں کی جاتی لیکن بہت زیادہ نشے کے عادی اسے استعمال کر لیا کرتے ہیں۔ یہ اعصابی تشنج پیدا کر کے دماغ کو مفلوج کر دیتی ہے۔''

''ایگزومائن میں نہیں جانتا، لیکن لیکن آہ......! ہاں واقعی یقیناً، یقیناً'' وہ جیسے اپنے آپ میں کھو سے گئے انہیں مرینہ کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''اندازاً کتنے عرصے سے آپ یہ انجکشن لے رہے ہیں؟''

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا میں صحیح وقت نہیں بتا سکتا۔" رب نواز صاحب نے مضمحل لہجے میں کہا۔

"دوسری نشہ آور اشیاء بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ آپ جیسے شراب وغیرہ؟"

"ہاں ڈاکٹر۔"

"یہی وجہ یہ کہ یہ خطرناک دوا آپ کے ساتھ وہ سلوک نہ کر سکی جو اس کی خاصیت ہے۔ بہرحال اب اس کے اثرات زائل ہو چکے ہیں۔ میں نے انتہائی طاقتور انجکشن دے کر آپ کے بدن سے اس دوا کے اثرات نکالے ہیں۔ اُمید ہے اب آپ کی وہ کیفیت نہیں ہو گی۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھئے گا اب کوئی بھی نشہ آور چیز آپ کے لئے سخت مضر ہو گی۔ اس کا سخت خیال رکھا جائے۔"

رب نواز صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر اپنا سامان سمیٹ کر اُٹھ گیا۔

بہرحال رب نواز کو وہ ساری باتیں یاد آتی رہی تھیں۔ اس بہتر کیفیت نے انہیں اور زیادہ دُکھ دیئے تھے۔ پھر مزید کئی دن انہیں اس اُلجھن میں گزارنا پڑے۔ ڈاکٹر اکثر آتا رہتا تھا۔ انہیں دوائیں دیتا، انجکشن دیتا تھا، تاکہ ان کے اعصاب پُرسکون رہیں۔ ابھی تک غذا بھی مصنوعی طور پر دی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر اور ملازموں کے علاوہ اس نے آج پہلی بار ایک نئی شکل دیکھی تھی۔ یہ ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا جو ان کے سامنے آیا تھا۔ وہ ان کے پاس پہنچا اور اس نے انہیں اپنے ہاتھ سے غذا دی۔ رب نواز صاحب کی جسمانی حالت اب بالکل ٹھیک تھی۔ بوڑھے شخص نے انہیں تھرماس سے چائے انڈیل کر دی اور رب نواز صاحب نے بڑی فرحت محسوس کی تھی۔

"میں پہلی بار آپ کو دیکھ رہا ہوں جناب کیا آپ مجھے یہاں کے بارے میں نہیں بتائیں گے کہ یہ پُراسرار جگہ کونسی ہے؟ یہاں میری بہت اچھی نگہداشت ہوئی ہے اور میں اس گھر کا احسان مند ہوں اور اس میں رہنے والوں کا بھی جنہوں نے بے لوث اور بے غرضی میری مدد کی ہے۔ آپ لوگ کون ہیں اور آپ نے مجھ جیسے ناکارہ اور بے مقصد انسان کے لئے یہ تکلیف کیوں اٹھائی ہے کیا آپ بھی مجھے یہاں کے بارے میں

نہیں بتائیں گے؟"

بوڑھے شخص کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس نے کہا۔

"یہ میرا گھر ہے رب نواز۔"

"آپ آپ مجھے جانتے ہیں؟" رب نواز اچھل پڑا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ تم بھی اگر کوشش کرو تو مجھے پہچان سکتے ہو۔ تمہاری عنایات نے مجھے بوڑھا ضرور کر دیا ہے لیکن اگر کوشش کرو تو میرے نقوش اس قدر تبدیل نہیں ہوئے ہیں اور پھر ہم لوگ اس قدر گہرے دوست رہ چکے ہیں کہ نقوش اتنی آسانی سے نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔"

عجیب و غریب الفاظ تھے رب نواز آنکھیں پھاڑنے لگا اور پھر اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اس کے دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور پھر اس کے منہ سے ایک مدھم سی مسکراہٹ نکلی۔

"مرزا جمال بیگ۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھے ضرور پہچان لو گے۔" بوڑھے شخص کی آواز ابھری۔

"تم جمال بیگ تم زندہ ہو تم تو......"

"ہاں میں زندہ ہوں کیا معلوم ہوا تھا میرے بارے میں؟"

"یہی کہ تم ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ سزا کاٹنے کے بعد تم یورپ چلے گئے تھے۔"

"اپنی روح تو یہیں چھوڑ گیا تھا رب نواز ملک سے باہر کیسے رہتا۔ ایک پل چین نہیں ملا۔ مجھے ایک پل چین نہیں ملا۔ تم جانتے ہو اگر یہ پتہ چل جائے کہ کوئی دنیا سے چلا گیا ہے تو صبر آ جاتا ہے لیکن میری بیوی اور میری بچی...... میں آج تک ان کے لئے سرگرداں ہوں۔ آج تک دُکھا ہوا ہوں۔ تم نے جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا اس کے اور تو جو نتائج مجھے بھگتنا پڑے، وہ الگ بات ہے لیکن مجھے میری عائشہ مجھے میری بیوی نہیں مل سکی۔ میں اسے اس کی بہن کے پاس چھوڑ کر گیا تھا لیکن ان لوگوں کا کب کا انتقال ہو گیا۔ یہ بات مجھے جیل سے رہا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوئی تھی۔ میری بیوی اور

میری بیٹی دربدر ہو گئے۔ اب نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ نجانے کتنے عرصے میں ان کی تلاش کر رہا ہوں۔ نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔

''تم کہاں رہتے ہو۔ کہاں رہتے ہو تم؟''

''یہیں اسی شہر میں جہاں تم نے اپنی شاندار فرم بنائی ہوئی ہے۔''

''کیا کر رہے ہو؟''

''ایک چھوٹا سا کاروبار لیکن مرزا جمال بیگ کی حیثیت سے نہیں۔ حسن علی کی حیثیت سے۔ جمال بیگ کو تم اس شہر میں کہاں زندہ رہنے دیتے تمہارے تعلقات بہت وسیع تھے، تمہارے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ رب نواز دلچسپی تھی تو صرف ایک میری بیٹی جو اب جوان ہو گئی ہو گی۔ اگر زندہ رہی ہے تو میری بیوی جو بوڑھی ہو گئی ہو گی میری طرح۔''

مرزا جمال بیگ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ رب نواز نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے دل و دماغ کی حالت بہت بُری تھی۔ جس شخص کو اس نے زندہ درگور کر دیا تھا اسی نے اس بُرے وقت میں اس پر احسان کیا تھا۔ دیر تک وہ آنکھیں بند کئے خاموش رہا پھر بولا۔

''مگر میں تمہیں کہاں سے مل گیا مرزا جمال بیگ؟''

''ایک سڑک پر کوڑا گھر کے کنارے تم نیم مردہ حالت میں مجھے ملے تھے۔''

مرزا جمال بیگ نے جواب دیا اور رب نواز کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ دیر تک وہ عجیب سی کشمکش کا شکار رہا پھر بولا۔

''کون کہتا ہے کہ گنہگاروں کو سزا نہیں ملتی۔ جمال بیگ مجھے دیکھو تمہاری حالت مجھ سے ہزار درجے بہتر ہے، لیکن میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا۔ جمال بیگ کیونکہ یہ میری ایک اور بے غیرتی ہو گی۔ میں معافی کے قابل ہی نہیں ہوں۔ مگر ایک سوال کا جواب دو گے مجھے......؟''

''ہاں پوچھو۔'' مرزا جمال بیگ نے رد،

''تم نے مجھ سے انتقام کیوں نہیں لیا جمال بیگ۔ تم نے میرے بدن میں کیڑے کیوں نہیں پڑنے دیے۔ مجھے اس بُری حالت میں دیکھ کر تم نے قہقہے کیوں نہیں لگائے۔'' رب نواز کی آواز میں لرزش تھی ایک بار پھر تھوڑی دیر تک خاموشی طاری ہو گئی پھر مرزا جمال بیگ نے کہا۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے رب نواز۔ میں فرشتہ نہیں ہوں، لیکن جو انتقام میں نے تم سے لیا وہ مختلف تھا۔ تم ٹھیک کہتے ہو جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا اس کے صلے میں مَیں تمہیں زندگی سے محروم کر دیتا لیکن زندگی سے محروم کرنا انتقام تو نہیں ہے۔ میں نے تم سے اپنی خواہش کے مطابق انتقام لیا ہے۔ یہ میرا انتقام ہی ہے رب نواز کہ تمہاری فرعونیت ختم ہو گئی ہے اور تم جو فرعون بے سامان بنے پھرتے تھے تم جو اپنے آپ کو ایک ناقابلِ تسخیر انسان سمجھتے تھے آج اپنی کیفیت دیکھ لو اب تم ایک مجبور اور بے کس انسان ہو اور تمہیں اس حال تک پہنچانے والا اور کوئی نہیں ہے مرزا جمال بیگ ہے۔''

''کیا......کیسے؟'' رب نواز اپنی کیفیت کے باوجود حیرانی سے بولا۔

''ہاں میں نے ہی تمہیں اس حال میں پہنچایا ہے رب نواز سمجھے تم۔ میں نے اپنا انتقام تمہارے بیٹے کے ذریعے لیا ہے۔''

''کک......کیا؟'' رب نواز کا منہ ایک بار پھر حیرت سے کھل گیا۔

''ہاں۔ تمہارا بیٹا اختر نواز۔ میں نے ہی اسے اپنا آلہ کار بنایا۔ اس وقت جب تم نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ میں نے ہی اسے وہ انجکشن فراہم کئے تھے جنہوں نے تم سے تمہاری دماغی طاقت چھین لی اور تم اعصابی تشنج کے مریض بن گئے۔ تمہیں یہ مرض میں نے انعام میں دیا ہے رب نواز۔ چھوڑا نہیں میں نے تمہیں اور مجھے اپنے اس انتقام پر اطمینان ہے۔ پورا پورا بدلہ لے لیا ہے میں نے تم سے اور میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔ رب نواز میں نے ہی اس لڑکی کو تمہارے پیچھے لگایا تھا جو تمہارے ظلم کا شکار ہو کر جیل چلی گئی تھی اور پھر جیل کی سزا کاٹ کر میرے پاس نوکری کیلئے آئی تھی اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو وہ اختر نواز تک نہ پہنچ پاتی۔ میں نے اس لڑکی کے ذریعے

تمہارے بیٹے پر ڈورے ڈالے جو تمہاری طرح بُرا انسان نہیں تھا بلکہ ایک باپ کا گندا خون بھی اس کی فطرت نہیں بدل سکا اور اس کے اندر انسانیت موجود تھی۔رب نواز اس لڑکی نے اختر نواز سے دوستی کی صرف میرے ایما پر اور پھر میں نے ہی ان دونوں کی شادی کرادی اور پھر اس طرح کے حالات پیدا کر دیئے کہ تمہارا بیٹا تمہارے خلاف ہو گیا۔

یاد ہے وہ لڑکی جس پر تم نے چوری کا الزام لگا کر جیل بھجوا دیا تھا اس لئے کہ وہ تمہاری ہوس کا شکار نہیں بنی تھی۔رب نواز کیا مزے کی بات ہے کہ وہ لڑکی جس کی آبرو لوٹنے کی کوشش تم نے کی تھی وہ تمہاری بہو ہے۔تمہاری بیٹی ہے۔ وہ لڑکی بھی میری طرح تمہارے مظالم کا شکار تھی۔ اس لئے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی اور تمہیں اس حال تک پہنچا دیا۔سمجھے یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ ہو سکتا ہے تمہارے ذہن میں موت تمہارے گناہوں کا صلہ ہو لیکن میری سوچ مختلف ہے۔مر کر تو انسان بہت سے احساسات سے دور ہو جاتا ہے لیکن تم لمحہ لمحہ مرتے رہو گے۔ یہ تمام باتیں سوچ کر اس وقت تک جب تک تمہارا دماغ پھٹ نہ جائے، جب تک کہ تم اپنی وحشت کا شکار ہو کر خودکشی نہ کر لو کیا خیال ہے؟'' جمال بیگ کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔اس نے خونی نگاہوں سے رب نواز کو دیکھا لیکن یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ رب نواز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی چند لمحات خاموش رہا پھر بولا۔

''تم نے ایک اور احسان کر ڈالا میرے اوپر۔ میرے دوست کتنے احسانات کرتے رہے ہو تم۔ زندگی بھر مجھ پر تمہارا آخری احسان یہ ہے کہ تم نے میرے سینے کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر دیا۔ میں اسی قابل تھا جمال بیگ۔ واقعی میں اسی قابل تھا۔میری جان تم نے مجھے اس حال میں پہنچانے کے بعد میری موت کا تماشہ کیوں نہیں دیکھا؟ میری سزا کیوں نہیں پوری ہونے دی؟ کیا یہ زیادہ اچھا نہیں تھا کہ میں اسی کوڑے دان کے کنارے ایک لاوارث لاش کی حیثیت سے پڑا رہتا اور اگر اس لاوارث لاش کی تشہیر ہو جاتی تو موت کے بعد بھی لوگ میری قبر پر تھوکتے اور میرا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔''

''تم شاید مجھے میری کامیابی پر خوش نہیں ہونے دینا چاہتے۔'' جمال بیگ نے

تیکھی نظروں سے رب نواز کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ میں سمجھا نہیں۔''

''اپنے گناہوں پر تائب ہو کر تم مجھے ناکام کرنا چاہتے ہو۔''

تم نے کہا تھا کہ مجھے زندہ رہنا چاہیے۔ مجھے لمحہ لمحہ مرنا چاہیے۔ مجھے اپنی وحشت کا شکار ہو کر خودکشی کر لینی چاہیے۔''

''میں یہی چاہتا تھا۔'' جمال بیگ بولا۔

''تو پھر مجھے کچھ عرصہ جینے دو۔اس احساس کا شکار ہونے دو کہ مجھے میرے بیٹے نے اس حال پر پہنچایا ہے۔ مجھے اس کرب کا شکار ہونے دو کہ میں نے جس لڑکی کی اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی تھی وہ اب میری بہو ہے۔ مجھے ان احساسات سے لمحہ لمحہ مرنے دو۔تمہاری خوشی تمہارا انتقام پورا ہو جائے گا۔تم نے تو مجھے اپنی ساری دولت دے دی۔ اپنی زندگی کی خوشیوں کے سارے سال مجھے دے دیئے۔ اب مجھے ان کا معاوضہ بھی تو ادا کرنے دو۔ میری ہر اذیت پر تمہیں خوشی ہو گی اور مجھے یہ اطمینان ہو گا کہ میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہوں۔ بلکہ ایک کام اور کرو جمال بیگ، یہ تمہاری کوٹھی ہے نا؟''

''ہاں بولو۔''

''مجھے واپس میری کوٹھی بھجوا دو۔ پہلے میں وحشت زدہ ہو کر وہاں سے نکل بھاگا تھا۔ میں نہیں جانتا مجھے میرے بیٹے نے تلاش کرنے کی کوشش کی یا نہیں کی۔ نہیں کی ہو گی ورنہ میں اسے مل جاتا۔کون سا میں نے شہر چھوڑ دیا تھا۔تو تم مجھے واپس میری کوٹھی بھجوا دو اور ان سے کہو کہ مجھے شدید اذیت دیں۔ مجھے پیٹ بھر کر کھانا نہ دیں۔نوکروں کے کوارٹر میں مجھے ڈال دیں تا کہ ہر لمحہ میری انا ٹوٹے۔ اصل میں، میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جمال بیگ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔تمہیں متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔ میری اعصابی کیفیت جو ہو چکی ہے اس میں اب اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میں تمہارے یا اپنے بیٹے یا اپنی بہو مرینہ کے خلاف

کوئی انتقامی کارروائی کرسکوں۔

میں تو ایک تباہ شدہ مخلوق ہوں جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ بلکہ اب میری یہ رائے ہے کہ مجھے وہ انجکشن بھی برابر دیئے جاتے رہیں تاکہ میری اذیت میں اضافہ ہوتا رہے۔ کیا خیال ہے، کیسی تجویز ہے؟'' رب نواز نے کہا اور جمال بیگ کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔

''نہیں رب نواز، ان ساری باتوں کے باوجود میں ایک انسان ہوں اور انسانیت کی جو تذلیل میرے ہاتھوں ہوئی ہے اس سے زیادہ میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ میرا انتقام پورا ہو چکا ہے۔ میں نے اس شخص کو معاف کر دیا ہے جس نے مجھ سے میری دنیا، میری بیوی اور میری بیٹی چھین لی۔ میں واپس آیا تو پتہ نہیں کیا کیا خیالات دل میں لے کر آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمارے دُکھ کے دن بیت گئے اور میری بیوی اور میری بیٹی میرے ساتھ ہوں گے۔ اور ہم ان تمام محرومیوں کو ختم کر دیں گے جو ہماری زندگی کا حصہ رہی ہیں۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میری بیٹی تو اب کئی سال کی ہو چکی ہو گی، اسے ایک شہزادی کی طرح پروان چڑھاؤں گا، لیکن یہ تمام حسرتیں، حسرتیں ہی رہ گئیں، چلو چھوڑو، جو جانا تھا وہ چلا گیا، جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے ان دونوں کو تلاش کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن مجھے ان کا کہیں نشان نہیں مل سکا۔ خیر اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی قرض باقی نہیں رہا، ہاں ایک کارڈ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر اپنی آخرت کے لیے بھی کچھ کرنا چاہتے ہو، اگر مجھ پر کیے گئے مظالم کا احساس کر کے ایک فرضِ انسانی پورا کرنے کا خیال دل میں آئے تو مجھ پر ایک احسان کر دو، ہمارا پرانا حساب ختم ہو چکا ہے۔ آؤ نیا حساب کتاب شروع کر دیں، ایک نیا کھاتہ کھول لیں، مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا میری بیوی اور میری بیٹی کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے، مجھے ان کا پتہ بتا دو کہ وہ کہاں چلی گئیں کیا تم نے انہیں قتل کرا دیا، اس احساس کے تحت کہ کہیں وہ ساری دولت جو میں نے تمہیں منتقل کی

ہے اس کی حصے دار یہ دونوں نہ بن جائیں۔ بتا دو میرے دوست کیا تمہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

جمال بیگ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور رب نواز دو قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جذبات کی شدت سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جمال بیگ کی آستین پکڑ لی۔

''خدا کے لئے جمال بیگ، خدا کے لئے آنسو پونچھ لو۔ اب یہ آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔ تم یقین کرو وقت نے میرا دل سیاہ کر دیا تھا ورنہ میں تمہارا اچھا دوست تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو چاہتے بھی رہے ہیں۔ وہ جو کچھ ہوا اپنے مستقبل کے خیال سے ہوا اور پھر میری کچھ عادتیں بھی بگڑ گئیں۔ میں قابلِ معافی نہیں ہوں، جمال بیگ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے بدلے میں تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ تمہاری عظمت ہے کہ تم نے مجھے جلدی معاف کر کے انسانیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ میرے دوست تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر مجھے بھابی اور عائشہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو میں تمہیں بتاؤں۔

آہ! کاش ایک ایسا لمحہ بھی آ جاتا کہ میں تم سے کہتا کہ آؤ جمال بیگ تمہارے احسانات کے صلے میں مَیں تمہارا کنبہ تمہیں واپس کر دوں۔ لیکن میرے قبضۂ قدرت میں یہ بھی نہیں ہے۔ ہاں میں تمہیں تھوڑی سی تفصیل بتانا چاہتا ہوں جو یوں ہے کہ بیچاری بھابی کو ہمارے درمیان ہونے والی چپقلش کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں ان کی تھوڑی بہت کفالت کر رہا تھا جیسا کہ تمہارے علم میں آ چکا ہے کہ بھابی کی بہن اور بہنوئی نے وہ جگہ بیچ دی تھی جہاں وہ رہتے تھے اور اس کے بعد وہ کہیں روپوش ہو گئے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ میں نے پہلے ہی بھابی کو وہاں سے نکال لیا تھا۔ میں نے ان سے بھی فراڈ کیا تھا۔ جب مجھے تم سے خطرہ محسوس ہوا تو میں بھابی کے پاس پہنچ گیا، میں نے ان سے کہا کہ جمال بیگ قتل کے مقدمے میں پھنس گیا ہے، اس نے دو افراد کو قتل کر دیا ہے اور روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اُس کی بیوی اور بیٹی کو گرفتار کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ چنانچہ مرزا جمال بیگ

کی ہدایت ہے کہ ان دونوں کو فوراً کہیں چلے جانا چاہیے۔ اس طرح میں انہیں وہاں سے نکال لایا اور میں نے ایک چھوٹی سی آبادی میں ایک گھر حاصل کر کے انہیں وہاں مقیم کر دیا۔ میں نے ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں ایک رقم بھی دی اور کہا کہ وہ بالکل روپوش رہیں اور کسی سے ملنا جلنا نہ رکھیں اور خاموشی سے وقت گزارتی رہیں۔ بھابی نے میری بات مان لی۔ میں مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور یہاں میرے اور تمہارے درمیان چکر چلتا رہا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک اور بات سوچی تھی وہ یہ کہ میں ان کے ذریعے تم سے وہ کاغذات حاصل کر لوں اور دستخط کرادوں اور میں نے وہ سب کچھ کر لیا۔ لیکن تمہاری زبان کا بند رکھنے کا ذریعہ بھی وہی دونوں تھیں اس لئے میں نے تمہیں ان تک نہیں پہنچنے دیا۔

تمہارے واپس آنے کے بعد میرا خیال یہ تھا کہ میں تم سے ان کاغذات پر دستخط کرا لوں اور اس کے بعد تمہیں بھابی اور عائشہ تک پہنچا دوں۔ میں تمہاری کفالت بھی کرتا لیکن بہر طور سارے مسئلے حل ہو گئے۔ البتہ دوسری شکل میں میں زخمی ہو گیا اور تمہیں جیل ہو گئی۔ لیکن تندرست ہونے کے بعد بھی میں خوفزدہ تھا کیونکہ بھابی قانون کے سامنے پیش ہو سکتی تھیں، چنانچہ میں دوبارہ ان کے پاس گیا اور میں نے انہیں تمہاری موت کی خبر سنائی۔ میں نے کہا کہ تم پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے ہو لیکن پولیس کو اب بھی مرزا جمال بیگ کی بیوی اور بیٹی کی تلاش ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ مکمل طور پر روپوش رہیں اور ممکن ہو تو اپنا نام بھی بدل لیں۔ بس بھابی اور عائشہ کی کہانی مجھے یہیں تک معلوم ہے۔ اس کے بعد میں نے ان کی کبھی خبر نہیں لی۔ مجھے نہیں معلوم کہ پھر کیا ہوا۔

”آہ! مگر یہ بات تو تمہارے علم میں ہے کہ وہ گھر کہاں ہے جہاں تم نے انہیں بھیجا تھا؟“

”ہاں...... وہ گھر معلوم ہے۔ میں تمہیں وہاں لے چلنے کے لئے تیار ہوں ممکن

ہے خدا مجھے اس آخری وقت میں سرخرو کر دے۔ میرے دوست تیاری کرو خدا کا واسطہ جلدی کرو۔“

”مگر تمہاری حالت بہتر نہیں ہے تھوڑا سا توقف کر لو۔ میں تمہارا بہترین علاج کراؤں گا تم تندرست ہو جاؤ گے۔ پتہ نہیں اللہ نے میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ لیکن میرے دوست مجھے دوستی کے وہ لمحات یاد ہیں جب ہم تم ساتھ بیٹھتے تھے، ساتھ اُٹھتے تھے، ساتھ کھاتے تھے ساتھ پیتے تھے۔ میں درمیان کی ساری باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے ایک مرتبہ تم پھر ایک تندرست انسان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آؤ۔ رب نواز میرے دوست میں نے اپنا دل صاف کر لیا ہے بس تم ٹھیک ہو جاؤ۔“

”تمہیں خدا کا واسطہ...... تمہیں خدا کا واسطہ میں بالکل ٹھیک ہوں جلدی کرو کہیں یوں نہ ہو کہ مجھے کچھ ہو جائے۔ اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ جاؤ براہ کرم اُٹھ جاؤ اُٹھ جاؤ۔“ رب نواز نے ہاتھ جوڑ دیئے اور مرزا جمال بیگ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ خود اس کی آرزو بھی یہ تھی کہ وہ اپنی لٹی ہوئی کائنات کے درمیان پہنچ جائے چنانچہ وہ تیاریاں کرنے لگا۔

اس علاقے کی آبادی کافی بدل چکی تھی لیکن رب نواز کے اندر جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، وہ معمولی نہیں تھی۔ بہرحال اس نے وہ مکان تلاش کر ہی لیا۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ یہ مکان تو چودہ پندرہ سال پہلے بک چکا ہے اور ایک پراپرٹی ڈیلر نے اس کا سودا کرایا تھا جو خاتون اپنی بیٹی کے ساتھ اس مکان میں رہتی تھی انہوں نے کہیں اور جگہ خرید لی تھی۔ البتہ پراپرٹی ڈیلر نے یہ بھی بتایا کہ یہ مکان بیچ کر اُس خاتون نے ایک اور مکان خرید لیا تھا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کو انہوں نے تیار کیا کہ وہ انہیں اس نئے مکان کے بارے میں بتائے اور آخر کار وہ اس دوسرے محلے میں بھی پہنچ گیا جہاں مرینہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی اور اسی گھر میں وہ جوان ہوئی تھی۔ لیکن جس مکان کے سامنے پراپرٹی ڈیلر نے اسے کھڑا کیا تھا اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ البتہ معلومات کرنے پر برابر والے گھر سے ایک صاحب نکل آئے اور جمال بیگ

سے لرزتی آواز میں کہا۔

''اس گھر میں ایک خاتون اور ان کی بیٹی رہتی ہیں۔کیا آپ ہمیں ان کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟''

''رہتی تھیں کبھی جناب۔بیچاری استانی جی تو مرگئیں بچوں کو سپارے پڑھاتی تھیں۔ان کی بیٹی کی شادی ہوچکی ہے اور وہ اپنے شوہر کے گھر رہتی ہے۔''

''مرگئیں۔''رب نواز اور جمال بیگ لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔رب نواز کی گردن جھک گئی تھی۔کچھ دیر کے بعد مرزا جمال بیگ نے کہا۔

''آپ کو اس لڑکی کے شوہر کا مکان معلوم ہے؟''

اس وقت پردے کے پیچھے سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

''اے رکیئے،اندر آیئے......ارے آپ انہیں جانے دے رہے ہیں۔یہ تو اپنی مرینہ کے چچا ہیں۔بلا لو اندر۔پوچھو کس کام سے آئے ہیں؟''

''اچھا آپ مرینہ کے چچا ہیں مگر ان لوگوں کا تو کوئی نہیں تھا۔''

''نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔اے لو،کل ہی تو مجھے مل گئی تھی۔مرینہ بیٹی پہلے فلیٹ میں رہتی تھی اب اپنے میاں کے گھر چلی گئی ہے۔ارے آپ آیئے تو سہی کل مجھے مل گئی۔اپنے گھر لے گئی کیا اللہ نے کوٹھی دی ہے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ جس ماں کی بیٹی تھی اور جتنے اچھے تھے یہ لوگ......''

یہ وہی خالہ تھیں جن کا شروع ہی سے مرینہ اور اس کی امی سے گہرا تعلق تھا۔بہرحال انہوں نے انہیں چائے وغیرہ پلائی اور پھر دونوں میاں بیوی انہیں مرینہ کے گھر لے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔مرینہ کا نام سن کر ایک عجیب سا احساس ہوا تھا ان دونوں کو۔لیکن جب خالہ جان نے ان دونوں کو رب نواز کی کوٹھی کے سامنے کھڑا کیا تو دونوں دنگ رہ گئے۔

''آئیں جی آئیں...... پتہ نہیں آپ کیوں اس گھر کو نہیں پہچان رہے۔مرینہ یہیں رہتی ہے۔کل ہی تو میں اس کے گھر سے ہو کر آئی تھی۔''رب نواز اور مرزا جمال بیگ کوٹھی میں داخل ہو گئے اور پھر جب ان کا سامنا مرینہ اور اختر

نواز سے ہوا تو جو ذہنی کیفیت چاروں کی ہونی چاہیے تھی، وہی ہوئی۔ساری کہانی منظر عام پر آ گئی۔

مرینہ، عائشہ کا بدلا ہوا نام تھا لیکن ماں نے اس کے نام کے ساتھ بیگ ضرور لگایا تھا اور یہ نام صرف اس لئے بدلے گئے تھے کہ کہیں پولیس مرزا جمال بیگ کی بیوی اور بیٹی کو تلاش نہ کر لے۔اس کے بعد جو ہونا تھا وہی ہوا۔باپ بیٹے اور باپ بیٹی مل گئے۔

بہرحال قدرت کی رسی دراز ہوتی ہے۔کوئی یہ نہ بھولے کہ وہ اپنے عمل میں ہمیشہ کامیاب ہی رہے گا۔اس گھر میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا اور جو المیے رونما ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ ذہنوں سے محو ہوتے جا رہے تھے۔کیونکہ یہی انسانی فطرت ہے۔

ختم شد

انوکھی ملازمت

بیروزگاری کھوپڑی کے اوپری حصے میں باریک باریک سوراخ کر دیتی ہے جن سے مایوسی کی ہوا اندر داخل ہو کر انسان کے ذہن و دل کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ اُمنگوں کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔ بزدلی کے باریک ذرّات اس ہوا کی خوراک حاصل کر کے طاقتور ترین ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بیروزگار انسان کبھی خودکشی کرتے ہیں، کبھی جرائم۔ میرے خیال میں ہر مجرم بزدل ہوتا ہے۔ تحریک جرم بزدلی کی پیداوار ہے۔ دلیر انسان جرم کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلیری سے ناگفتہ بہ حالات کو اپنا مطیع کرتا ہے۔ کسی بھی سلسلہ میں کوئی مجرمانہ خواہش دلیری سے شکست کھاتی ہے اس کے برعکس بزدل انسان اس خواہش سے مجبور ہو کر تکمیلِ جرم کر بیٹھتا ہے۔

میں اپنے ان نظریات پر سختی سے کاربند تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ مایوسی کی ہوا کو اپنے جسم میں سرایت نہ ہونے دوں۔ پورے ایک سال سے بیروزگار تھا اور ہر وہ کوشش کر چکا تھا جو میرے بس میں تھی لیکن ملازمت ملنی تھی نہ ملی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پُراسرار غیبی قوت میرے اور ملازمت کے درمیان حائل ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ ویسے خدا کا شکر تھا کہ میرے اوپر کوئی بہت بڑی ذمہ داری نہیں تھی۔ والد صاحب ریلوے سے ریٹائر تھے انہیں قلیل پنشن مل جاتی تھی جو اتنی ضرور تھی کہ اس سے آٹا اور دال خریدی جا سکے۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ مزید کچھ کریں۔ گھر میں ضعیف

والدہ اور ایک چھوٹی بہن کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سب کی نظریں میری ملازمت پر لگی ہوئی تھیں۔ زندگی آٹے دال سے ہی تو نہیں گزر سکتی تھی چنانچہ میں ملازمت کے حصول کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر جگہ ناکامی میرا استقبال کرتی تھی۔ کبھی کبھی مایوسی کی زہریلی ہوا میرے قریب سے گزر جاتی تھی۔ لیکن ایسے اوقات میں میرے اصول مجھے اس ہوا سے محفوظ رکھتے تھے اور ابھی تک میں نے شکست نہیں تسلیم کی تھی۔ میرا روزمرہ کا معمول تھا کہ کسی ریستوران میں جا کر اخبار میں ''ضرورت ہے'' کے کالم دیکھتا اور کسی بھی ضرورت کی جگہ درخواست ارسال کر دیتا۔ یہ درخواستیں میں نے درجنوں کی تعداد میں ٹائپ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔

اس شام جب میں ملازمت کی تلاش میں حسبِ معمول ناکام رہ کر گھر میں داخل ہوا تو خلافِ معمول گھر والے قدرے بشاش تھے۔ والد صاحب قبلہ کے ہونٹوں پر سوکھی ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔ رشیدہ کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں اور اماں جان کے چہرے پر بھی اُمیدیں جھلک رہی تھیں۔ گھر والوں کے اس موڈ سے مجھے بھی خوشی ہوئی اور میں نے دن بھر کی ناکامی کا بوجھ ہلکا محسوس کیا۔ باورچی خانے میں مسور کی دال کے ''سوپ'' میں روٹی بھگو کر کھاتے ہوئے میں نے دبی زبان سے والدہ صاحبہ سے اس مسرت کی وجہ پوچھی۔

''کھانا کھالو اس کے بعد تمہیں ایک خوشخبری سنائی جائے گی۔'' والدہ صاحبہ نے جواب دیا اور اس خوشخبری کو جلد از جلد سننے کے لیے میں نے سامنے رکھی ہوئی روٹیاں اور دال چشم زدن میں صاف کر دیں اور پانی پینے کے بعد والدہ صاحبہ سے اس خوشخبری کا مطالبہ کیا۔

اس مطالبے کے جواب میں والدہ صاحبہ نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جسے کھول کر پڑھ لیا گیا تھا۔ بہرحال مجھے اس کے پڑھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے لفافے میں رکھا ہوا کاغذ نکال لیا۔ ایک نفیس لیٹر پیڈ تھا جس پر ''ڈی ایم رانا'' لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ٹائپ کی ہوئی تحریر تھی اور یہ تحریر میرے لیے بےحد دل خوش کن تھی۔

تقریباً ایک ہفتہ قبل میں نے ایک اشتہار کے جواب میں درخواست بھیجی تھی اور یہ اس درخواست کا جواب تھا۔ مجھے اس ملازمت کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ میں درج ذیل پتے پر مسٹر رانا سے ملاقات کر لوں۔ ملاقات کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا جس کا مقصد تھا کہ یہ ملاقات کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔ دوسرے دن کا انتظار دوبھر تھا۔ میں نے والدہ سے کہا کہ میں اسی وقت مسٹر رانا کے پاس جاؤں گا۔ والد صاحب نے کہا بھی کہ دوسرے دن صبح میں وہاں جاؤں لیکن میرے لیے یہ وقت مشکل تھا چنانچہ مجھے اجازت مل گئی۔ میں نے جلدی جلدی شیو کھرچا، کپڑے دھونے کے صابن سے دو بار منہ دھویا، میری چھوٹی بہن نے جلدی جلدی میرے گرد آلود جوتے پر پالش کر دی اور دھوبی کے ہاں سے آئے ہوئے کپڑوں سے صاف بشرٹ اور پتلون نکال دی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں والدین کی دعاؤں کے ساتھ دروازے سے باہر نکل آیا۔

''ٹوٹے دروازے'' جانے والی بس کی سیٹ پر بیٹھا۔ میں اپنی ملازمت کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ خدا کرے میں ان لوگوں کی توقعات پر پورا اُتروں۔ ملازمت بھی معمولی نہیں تھی بلکہ ایک بڑے آدمی کو سیکرٹری کی ضرورت تھی اور یقیناً سیکرٹری کی حیثیت معمولی نہیں ہوتی۔

ٹوٹے دروازے کا علاقہ شہر کے انتہائی سرے پر تھا۔ اس کے بعد صنعتی علاقہ شروع ہوتا تھا۔ ویسے یہ علاقہ بھی رہائشی نہیں تھا۔ بہت پرانی آبادی تھی جہاں اِکا دُکا بنگلے نظر آ جاتے تھے اور ان بنگلوں میں سر پھرے ہی رہتے تھے کیوں کہ یہاں کوئی سہولت نہیں تھی۔ بازار میلوں دور تھے بہر حال مجھے ان باتوں سے کیا سروکار ہو سکتا تھا۔ میں بس کنڈکٹر کی آواز پر نیچے اُتر گیا۔ ٹوٹا دروازہ بنگلا نمبر چھتیس، میں نے زیرلب پتہ دہرایا اور گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے ان بنگلوں میں بنگلہ نمبر چھتیس تلاش کرنا تھا۔ اس بنگلے کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی بنگلہ نمبر چوبیس کے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے میں نے بنگلہ نمبر چھتیس کا پتہ پوچھا۔

''چھتیس نمبر'' چوکیدار نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچا اور پھر گیٹ سے چند

قدم باہر آ کر بنگلوں کا حساب لگانے لگا اور پھر چونک کر بولا۔

''ٹھیک ہے وہی ہو سکتا ہے۔ مگر اس بنگلہ کا پتہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں صاحب؟''

''مجھے اس میں ڈی ایم رانا صاحب سے ملنا ہے۔''

''ڈی ایم رانا!'' چوکیدار نے تعجب سے کہا۔

''مگر صاحب بنگلہ نمبر کوئی اور ہوگا چھتیس نمبر میں تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے دس سال سے تو میں یہاں ہوں میں نے اس بنگلے میں کسی کو نہیں دیکھا۔''

''اور مجھے چھتیس نمبر بنگلہ ہی بتایا گیا ہے؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چھتیس نمبر وہی ہے صاحب۔ وہ جس کی دیوار پر سلاخیں اُبھری ہوئی ہیں۔ آپ دیکھ لیں ممکن ہے کوئی وہاں آ گیا ہو۔'' چوکیدار نے شانے اُچکاتے ہوئے کہا اور میں حیران سا آگے بڑھ گیا لیکن اب میرے دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ تمام اُمیدوں پر اوس پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اگر کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو تو...... گھر والوں کے دمکتے ہوئے چہرے ماند پڑ جائیں گے اور مایوس زندگی کو جو منزل کی جھلک نظر آئی ہے وہ وسیع ویرانوں میں گم ہو جائے گی۔ یا خدا! ایسا نہ ہو میں نے صدق دل سے دعا مانگی اور آگے بڑھتا رہا۔

چھتیس نمبر، چوبیس نمبر بنگلے سے ایک فرلانگ کے قریب دور تھا۔ میں چند منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ گیٹ پر پیتل کی چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر ڈی ایم رانا لکھا دیکھ کر میں نے دل میں مسرت کی لہریں محسوس کیں۔

منحوس چوکیدار نے مجھے مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ گدھا کہیں کا۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے اس مذاق نے میرے دل کی کیا حالت کر دی تھی۔ میں نے لباس درست کیا اور دھڑکتے دل سے گیٹ پر دستک دی۔

گیٹ پر چڑھی ہوئی مٹی کی تہہ نیچے کھسکتی ہوئی نظر آئی اور میں بنگلے کے مکینوں کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔ ماڈرن لوگ نہیں ہیں شاید مفلوک الحال بھی ہوں

کیوں کہ بنگلے کی عمارت بالکل بوسیدہ تھی۔ بہر حال مجھے ان باتوں سے کیا غرض۔ مجھے تو ملازمت چاہیے۔ اگر وہ مفلوک الحال ہوتے تو سیکرٹری کی ضرورت کیوں پیش آتی؟ ممکن ہے وہ لوگ صرف انٹرویو یہاں لینا چاہتے ہوں۔ میری دستک کے جواب میں ابھی تک کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی چنانچہ میں نے دوبارہ دستک دی اور کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ گیٹ کی طرف آتی سنائی دی اور آخر گیٹ کی ذیلی کھڑکی جو زنگ آلود تھی تیز چرچوں کی آواز کے ساتھ کھل گئی۔ سب سے پہلے مجھے جو چہرہ نظر آیا وہ بے حد کریہہ تھا۔ لمبوترہ چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں، جن کی سفیدی دائروں سے باہر ڈھلک رہی تھی۔ ٹیڑھی ناک چوڑی بدنما ٹھوڑی جس پر شیو خودرو گھاس کی طرح اُگی ہوئی تھی۔ میلے غلیظ دانت، جو بڑے بڑے ہونے کی وجہ سے ہونٹوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ غرض کراہت کا جس قدر تصور ذہن میں آ سکتا ہے وہ اس شخص کے چہرے پر نمودار تھا۔ اوپر سے اس کی آواز!

"کیا ہے؟" اس نے پھٹے ڈھول جیسے بے سُرے لہجے میں پوچھا اور میں نے جلدی سے سلام داغ دیا لیکن اس سلام کا جواب نہیں ملا اور وہی سوال پھر دہرایا گیا۔

"میں رانا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنی سعادت مندی برقرار رکھی۔

"کیوں؟" وہی لہجہ۔ ویسی ہی کرختگی!

"رانا صاحب نے مجھے یاد کیا ہے۔ یہ دیکھو میری درخواست کا جواب۔" میں نے جیب سے کاغذ نکال کر اس کے سامنے کر دیا اور اس نے کاغذ پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے یہ بدماغ شخص بالکل بُرا نہ لگا۔ اس کی بدماغی کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی میں تو ہر حال میں ملازمت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر میں نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کھڑکی بند کر رہا تھا۔ مجھے رُکے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"سیدھے چلے جاؤ۔ رانا صاحب راہداری کے آخری کمرے میں ہوں گے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ تمام کے تمام کمرے بوسیدہ تھے۔ صرف وہی کمرہ کچھ مناسب نظر آ رہا تھا، جہاں مجھے جانے کا

اشارہ کیا گیا تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا اور دروازہ کھل گیا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں جناب؟"

میں نے انتہائی شائستہ لہجے میں پوچھا اور اندر سے ایک نرم آواز اُبھری۔

"تشریف لائیے۔" اس آواز کی نرمی اور شرافت محسوس کر کے میرا دل بڑھ گیا۔ اور میں بے جھجک اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول باہر کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ کمرہ نہایت صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ فرش پر نرم اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر پرانے طرز کی تصویریں آویزاں تھیں۔ آبنوسی فرنیچر سے پورا کمرہ سجا ہوا تھا۔ ایک طرف چند آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کرسی پر بھاری بھرکم شخص بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر نفیس قسم کا تھری پیس سوٹ تھا۔ ناک پر ایک عمدہ عینک بھی رکھی تھی اور گھٹنوں پر ایک کھلی کتاب موجود تھی جسے شائد اس نے پڑھتے پڑھتے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں چونکہ تاریکی تھی۔ اس لیے اس شخص کے سرہانے ایک میز پر اونچے شیڈ کا پرانے طرز کا لیمپ بھی رکھا تھا جس کی روشنی نے کمرے کے ماحول کو اور خوشگوار بنا دیا تھا۔

اس نے ناقدانہ نظروں سے میرے چہرے کا اور پھر جسم کا جائزہ لیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "ہوں! تو آپ ہی مسعود صاحب ہیں؟"

"جی۔" میں نے دل ہی دل میں اس کی قیافہ شناسی کی داد دی۔

"تشریف رکھیے۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تعلیم ہے آپ کی؟"

"بی۔ اے ہوں۔"

"خوب' شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"اور کوئی ہے؟"

’’جی والدین اور ایک بہن۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’بات یہ ہے مسعود صاحب کہ آپ کو قصبہ رتولی جانا ہو گا۔ داور محمود صاحب وہیں رہتے ہیں' رتولی کے بائیں سمت' پنڈت رام سرن کی دھرم شالہ ہے اس کے پیچھے ان کی رہائش گاہ ہے۔ رتولی اسٹیشن پر اُتر کر آپ کسی تانگے والے سے کہیں گے' تو وہ آپ کو رام سرن کی دھرم شالہ پہنچا دے گا۔ بس اس کے پیچھے پگڈنڈی پر چلے جایئے آپ کو دور ہی سے داور صاحب کی حویلی نظر آ جائے گی۔ مگر...... ہاں میں آپ کو یہ سب کچھ قبل از وقت بتا رہا ہوں' پہلے تو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ اس ملازمت کو پسند بھی کریں گے یا نہیں؟‘‘

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا' کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کے بارے میں والدین سے کوئی اجازت نہیں لی تھی' لیکن اس بارے میں اجازت لینے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ بے روزگاری نے اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ یہ ملازمت نعمت عظمیٰ معلوم ہو رہی تھی' چنانچہ میں نے کہا۔

’’جی میں ان لوگوں کو چھوڑ کر رتولی جانے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے آپ وہاں بہت خوش رہیں گے۔ کوئی خاص کام نہیں کرنا ہو گا' ان کے اہلِ خاندان میں سے ایک ہوں گے آپ۔ ہاں تو آپ کیا تنخواہ قبول کریں گے؟‘‘

’’اس سلسلے میں فیصلہ آپ ہی صادر فرما دیں!‘‘ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’بھئی آپ اگر معیاری انسان نکلے تو داور صاحب کو ہر تنخواہ منظور ہو گی۔ ویسے فی الحال چار ہزار روپے ماہوار مناسب رہیں گے۔ یہ چار ہزار آپ کے والدین کے لیے ہوں گے' آپ کے تمام اخراجات داور صاحب کے ذمہ۔‘‘

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ میں تو ڈیڑھ دو ہزار کا منتظر تھا، چار ہزار تو میرے تصور میں بھی نہیں تھے' تاہم میں نے خود پر کنٹرول حاصل کیا اور بمشکل بولا۔

’’مجھے منظور ہے جناب۔‘‘

’’خوب' ٹھیک ہے' تم خود کو داور صاحب کا سیکرٹری محسوس کرو۔ اور ہاں یہ ایک ماہ

کی تنخواہ پیشگی قبول کرو تا کہ سفر کے انتظامات میں دقت نہ ہو۔ رتولی کب تک پہنچو گے؟‘‘

’’جی' دو دن کے اندر اندر‘‘ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ یہ چار ہزار روپے پورے گھر کی قسمت بدل سکتے تھے۔

’’میری طرف سے مزید دو دن! چوتھے دن تمہیں رتولی میں ہونا چاہیے۔‘‘

’’بہت بہتر۔‘‘ میں نے ادب سے جواب دیا اور رانا صاحب کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ادب سے کھڑا ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ بات ختم ہو گئی ہے اور مجھے جانے کی اجازت ہے۔ میں بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ کریہہ صورت چوکیدار مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس وقت چوکیدار سے بھی عقیدت تھی جس کے بارے میں نے سوچا تھا کہ اس کی شکل دیکھی ہے' ملازمت ولازمت کیا ملے گی۔ بس اسٹاپ میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ میری خوشیاں عروج پر تھیں اور میں گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی جلد از جلد ان مسرتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ بس میں بیٹھتے ہوئے میں نے چار ہزار روپے کے نوٹ احتیاط سے رکھ لیے' خدانخواستہ میری مسرتوں کو کوئی لوٹ لے جائے۔ مجھے ڈرائیور کی سست رفتاری پر غصہ آ رہا تھا' بہرحال خدا خدا کر کے گھر پہنچا' سب میرے منتظر تھے۔ میرے چہرے پر شادمانی دیکھ کر سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ اور میں نے جلدی سے چار ہزار روپے کے نوٹ نکال کر والدہ کے قدموں میں ڈال دیئے۔ والدہ نے نوٹ دیکھے اور ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چھلک آئے۔ انہوں نے نوٹ اُٹھا کے والد صاحب کو دیئے اور خود وضو کرنے چلی گئیں۔ انہیں شکرانے کے نفل پڑھنے تھے۔ میں والد صاحب کو اپنی ملازمت کے بارے میں بتانے لگا۔ دوسری جگہ جانے کی خبر سن کر والد صاحب کے چہرے پر کچھ تفکر کے آثار اُبھرے لیکن وہ مطمئن ہو کر بولے!

’’ٹھیک ہے بیٹے! رتولی زیادہ دور بھی نہیں ہے مہینے میں ایک بار تو تم ضرور ہی آؤ گے؟‘‘

’’ضرور ابا جان! میں اپنی کارکردگی اور طرزِ عمل سے ان لوگوں کو اس قدر خوش کر لوں گا کہ مجھے ہر سہولت مل جائے گی۔‘‘

والدہ بھی نماز پڑھ کر واپس آ گئیں اور والد صاحب انہیں میری ملازمت کے بارے میں تفصیل بتانے لگے۔ والد صاحب کی طرح وہ بھی قدرے پریشان ہوئیں لیکن پھرانہوں نے خدا کا شکرادا کیا۔قصبہ رتولی بہت زیادہ دُور بھی نہیں تھا اور کسی بھی وقت وہاں سے واپس آیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس دن سے میری روانگی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور...... تیسرے دن میں رتولی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسٹیشن پر میرے والد، والدہ اور بہن چھوڑنے آئے تھے اور میں ان کی نیک دعاؤں کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ گیا۔اب میں صرف اپنی ملازمت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ بہرحال میں بے حد پُرخلوص تھا اور پروگرام بنا رہا تھا کہ کسی کو اپنی طرف سے شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

خیالات کے ہجوم میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ٹرین کئی بار مختلف اسٹیشنوں پر رُکی اور پھر رتولی کا چھوٹا سا اسٹیشن آ گیا۔ میں نے پلیٹ فارم پر لکھا ہوا بورڈ پڑھا اور جلدی سے اپنی چھوٹی سی اٹیچی لے کر نیچے اُتر گیا۔ میرے ساتھ دو تین آدمی اُترے تھے۔ پلیٹ فارم کے باہر دو تین تانگے کھڑے تھے جن کے گھوڑے مریل تھے۔ تانگے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ تانگے والے بھوکی نظروں سے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک تانگے والے کو اشارہ کیا اور اس نے تانگے سے کود کر میری طرف دوڑ لگائی اور پھر آتے ہی میرے ہاتھ سے اٹیچی چھین لی، جیسے اسے خدشہ تھا کہ کوئی اور میری اٹیچی نہ اُچک لے۔

''کہاں جائیں گے بابو جی؟'' اس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

''مجھے رام سرن کی دھرم شالہ جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور تانگے والا ایک لمحے کے لیے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''آیئے بابو جی!'' اور میری اٹیچی لے کر آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے تانگے پر بیٹھ گیا اور پھر میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''کتنے پیسے لوگے بھائی؟''

''جو دل چاہے دے دیں بابو جی!'' تانگے والے نے گھوڑے کو چابک رسید

کرتے ہوئے کہا اور تانگا چل پڑا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ فاصلے کا اندازہ کر کے پیسے دے دوں گا۔ تانگے والا غیر معمولی طور پر خاموش تھا، لیکن مجھے اس وقت اس کی خاموشی پر دھیان دینے کی فرصت کہاں تھی۔ میں تو اپنی ملازمت میں مگن تھا۔ دھرم شالہ اسٹیشن سے کافی دور نکلی گھوڑا بھی سست رفتار تھا، اس لیے یہاں تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ویسے دھرم شالہ رتولی کے آخری مکان سے بھی کم از کم ڈیڑھ میل دور تھی۔ دھرم شالہ سے پچاس گز دور ہی تانگے والے نے تانگہ روک لیا۔

''وہ سامنے دھرم شالہ ہے بابو جی!''

''چلو بھئی، اس کے قریب چلو۔'' میں نے تانگے والے سے کہا۔

''بابو جی جناور ڈر جائے گا۔ یہیں اُتر جایئے۔'' اس نے بدستور گھگیاتے ہوئے کہا۔

میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن اس کے گھگیائے ہوئے لہجے نے مجھ پر اثر کیا اور میں نیچے اتر گیا اور پھر میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں نے پوچھا۔ اور تانگے والے کے منہ سے دعاؤں کی بھرمار ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر وہی خوشی دیکھی تھی جو مجھے چار ہزار روپے اور ملازمت ملنے کے بعد ہوئی تھی...... بہرصورت میں اپنی اٹیچی لے کر چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد دھرم شالہ کے قریب تھا۔ میرا خیال تھا کہ دھرم شالہ میں کوئی ہوگا لیکن دھرم شالہ ویران پڑی تھی پکی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی یہ عمارت انتہائی بدرونق اور بھیانک نظر آتی تھی۔ صحن میں پیپل کا درخت تھا جس کے پیلے سوکھے پتے پورے صحن میں بچھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بے نور عمارت سے خوف کا احساس ہوا۔ اور میں نے اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے زور سے آواز دی۔

''کوئی ہے؟''

میری آواز کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی اور پھر دھرم شالہ کا کہن سال دروازہ کھلا اور ایک فٹ بال نما چہرہ نظر آیا۔ یہ ایک موٹا تازہ ہندو تھا۔ جس کے چہرے پر بال کا نام ونشان نہ تھا بھنویں تک منڈی ہوئی تھیں۔ صرف سر کی پشت پر ایک چوٹی نظر آ رہی تھی۔ اوپری جسم ننگا تھا اور گردن میں جینؤ پڑا ہوا تھا۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں

سے مجھے گھورا اور بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''داور محمود کی حویلی کس طرف ہے؟'' میں نے پوچھا اور اس نے متنفر انداز میں پیچھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر کچھ کہے بغیر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے شانے ہلائے اور دھرم شالہ کے پیچھے کی طرف چل پڑا۔ یوں بھی رانا صاحب نے پتا بتا دیا تھا۔ دھرم شالہ کے عقب میں ایک پگڈنڈی صاف نظر آ رہی تھی اور پگڈنڈی کے اختتام پر وہ سیاہ حویلی نمایاں تھی۔ اگر میں کسی سے نہ بھی پوچھتا تب بھی مجھے وہ حویلی نظر آ جاتی۔ میں اطمینان سے حویلی کی طرف چل پڑا۔ خاصی دور تھی۔ پگڈنڈی کے دونوں سمت سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے ان پر کھلے پیلے پھول بہت پسند آئے اور میں ان سے لطف اندوز ہوتا آگے بڑھتا رہا اور اب حویلی چند گز دور تھی۔ میں نے رُک کر ناقدانہ نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ سرمئی رنگ کی پتلون اور کریم کلر ہاف آستین بشرٹ میں' میں خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بیروزگاری نے کس بل نکال دیئے تھے ورنہ بچپن ہی سے اچھا پہننے کا شوق تھا۔ چند لمحات کے بعد میں حویلی کے گیٹ پر تھا۔

عظیم الشان گیٹ سنسان پڑا تھا۔ دُور دُور تک کسی کا پتا نہیں تھا۔ میں نے ہمت کر کے گیٹ کی کھڑکی سے اندر قدم رکھا اور اندر داخل ہو گیا۔ باہر سے یہ حویلی پرانی اور بدرونق نظر آتی تھی، لیکن اندر سے کافی صاف ستھری اور شاندار تھی۔ گیٹ سے لے کر اندرونی صدر گیٹ تک مہندی کی باڑھ چلی گئی تھی' جسے نفاست سے تراشا گیا تھا۔ میں باڑھ کے درمیان چلتا ہوا صدر گیٹ کی طرف جانے لگا اور پھر میں باڑھ کے اختتام تک پہنچا ہی تھا کہ کوئی اچھل کر میرے سامنے آ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک آواز نکلی۔

''ہاؤ''

اور میں سچ مچ اُچھل پڑا۔ اس ویران اور پُراسرار ماحول میں یہ آواز مجھے بے حد خوفناک لگی تھی' لیکن...... پھر کانوں میں شہد گھل گیا...... ایک مترنم قہقہہ گونج اُٹھا تھا۔

''ڈر گئے؟'' وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے بولی اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس پُراسرار ماحول میں اس الٹرا ماڈرن لڑکی کی موجودگی میرے لیے سخت حیرت کا باعث تھی۔ اس کے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گھٹنوں سے اُونچے اسکرٹ میں اس کا حسین سڈول جسم بے حد دل کش نظر آ رہا تھا۔ خدوخال بے حد دل کش اور دل موہ لینے والے تھے اور چہرے پر معصوم سی معصومیت تھی۔ ہنسنے سے اس کے گالوں میں باریک گڑھے پڑ جاتے تھے جو اس کی دل کشی میں اور اضافہ کر دیتے تھے۔ اس وقت بے تحاشہ ہنسنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے معصومانہ انداز میں چہرے پر بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور ہنسی روک کر بولی۔

''میں نے تمہیں دُور سے ہی دیکھ لیا تھا اور اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ میں تمہیں ڈراؤں گی۔''

''میں سچ مچ ڈر گیا خاتون۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''خاتون؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''میرا نام خاتون نہیں' شمسہ ہے شمسہ۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مسعود۔'' میں نے جواب دیا۔

''خوب' یہاں کیوں آئے ہو؟''

''مجھے ڈی۔ ایم رانا صاحب نے بھیجا ہے۔ داور محمود صاحب سے ملنا ہے۔''

''ڈی۔ ایم رانا نے بھیجا ہے اور داور صاحب سے ملنا ہے؟'' وہ بولی اور پھر ہنس پڑی۔ کافی دیر تک ہنستی رہی۔

گو اس کی ہنسی بے محل تھی اور مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی' لیکن اس ہنسی کے حسن سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔

''اگر تکلیف نہ ہو محترمہ شمسہ تو مجھے داور محمود صاحب کے پاس لے چلیں۔'' میں نے درخواست کی۔

''آؤ''

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور گھسیٹنے والے انداز میں لے کر چل پڑی۔ میں کچھ جھجک محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کی بے تکلفی میری ملازمت کے لیے خطرہ نہ بن جائے' لیکن ابھی مجھے اس کی پوزیشن بھی نہیں معلوم تھی۔ مالکان کے تو ایک ایک فرد کا خیال رکھنا پڑتا ہے' چنانچہ میں نے تعرض نہیں کیا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر ایک راہداری میں چلتی رہی اور پھر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ پھر اس نے بے تکلفی سے دروازہ کھولا اور ہنستی ہوئی بولی۔

''لیجیے ڈیڈی' اپنے مہمان کو وصول کیجیے' انہیں ڈی۔ ایم رانا نے بھیجا ہے اور یہ داور محمود سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں چونکہ روشنی سے اس تاریک کمرے میں آیا تھا' اس لیے ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا اور جب میں دیکھنے کے قابل ہوا تو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

یہ ڈی ایم رانا تھا۔ وہی شخص جو مجھے میرے شہر میں ملا تھا اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

''آؤ مسعود' تم شمسہ کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟'' اس نے اسی مشفق مسکراہٹ اور اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

میں نے اٹیچی ایک طرف رکھ دی اور اسے سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔

''بیٹھو بھئی' دراصل میرا نام ہی داور محمود رانا ہے' یعنی ڈی۔ ایم سے داور محمود بنتا ہے۔'' اور میری سمجھ میں لڑکی کی ہنسی آ گئی۔ وہ اب بھی ایک دیوار سے لگی ہوئی ہنس رہی تھی۔

''تھینک یو شمسہ'' داور محمود نے کہا۔ ''تم جاؤ میں ان سے کچھ گفتگو کروں گا۔''

''پرائیویٹ گفتگو ہے ڈیڈی؟ میں خود بھی یہاں بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' لڑکی ضدی لہجے میں بولی اور داور ہنسنے لگا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے' بیٹھو۔'' اور لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم بھی بیٹھو مسعود!'' اور میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہم نے سیکرٹری کے لیے اشتہار دیا تھا نا شمسہ بیٹے' میں نے مسعود صاحب کو بہ حیثیت سیکرٹری رکھ لیا ہے اب تمہاری تنہائی بھی دُور ہو جائے گی۔''

''اوئی' ونڈر فل ڈیڈی' آپ نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔'' شمسہ نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا اور پھر جلدی سے بولی۔

''آپ کو بلیئرڈ آتا ہے مسعود صاحب؟''

''نہیں آتی ہو تو تم سکھا دینا۔'' داور محمود نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

''فی الحال تمہارے لیے کوئی کام نہیں ہے مسعود میاں۔ یہاں عیش و آرام سے رہو۔ کوئی تکلیف ہو تو فوراً بتا دینا۔ جب کوئی کام ہو گا تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ گھر کے دوسرے لوگوں سے بھی تمہاری ملاقات کر دی جائے گی۔ شمسہ تم انہیں ان کا کمرہ دکھا دو۔''

''اور وہ گفتگو ڈیڈی' جو آپ ان سے کرنے والے تھے......؟''

''وہ کوئی خاص نہیں تھی' بس رسمی سی باتیں تھیں جو کسی وقت بھی ہو جائیں گی۔ او۔کے مسعود۔'' داور نے کہا اور میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی اٹیچی اُٹھائی اور شمسہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا' وہ بالکل بچوں کی طرح اُچھلتی جا رہی تھی اور مجھے اس کی ادائیں بے حد بھا رہی تھیں۔ ان تمام حرکتوں میں معصومیت تھی' حالانکہ اس کی عمر انیس سال سے کسی طرح کم نہ ہو گی۔

پوری حویلی آرائش کے سامان سے آراستہ تھی۔ میرے لیے جس کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا وہ بھی قیمتی فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ میں نے ایسے کمرے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بہر حال میں اس کمرے میں مقیم ہو گیا۔ شمسہ ابھی تک میرے کمرے میں تھی اور مجھے حویلی کے نقشے سے آگاہ کر رہی تھی۔ پھر بولی۔

''ڈیڈی کو آپ سے کوئی کام نہیں ہو سکتا' دراصل میں تنہائی سے گھبراتی تھی۔ اس لیے انہوں نے آپ کو صرف میرے لیے ملازم رکھا ہے۔ بہر حال جب تک انہیں آپ سے کام نہ ہو' آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو قطعی بور نہیں

کروں گی۔ آپ کو میرے ساتھ بلیئرڈ کھیلنا ہوگا۔ میں آپ کو کھیل کے اوقات سے بہت جلد مطلع کر دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔ آپ آرام کریں۔'' اور وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر ایک آرام کرسی میں دراز ہو کر قصبے سے دُور اس پراسرار حویلی کے اس خوبصورت ماحول پر غور کرنے لگا۔ سونا سونا ماحول بہت دل کش لگ رہا تھا۔ یہاں کس قدر سکون تھا۔ حویلی میں شاید بہت کم لوگ رہتے تھے۔ ابھی تک میں نے رانا صاحب اور شمسہ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔ ویسے شمسہ کی شخصیت بڑی پُرسحر تھی۔ وہ کسی قدر معصوم اور الہڑ تھی، کتنی بے تکلف...... کیا یہ بات درست تھی کہ محمود رانا نے مجھے اس کا دل بہلانے کے لیے ملازم رکھا تھا۔ لیکن اس کے لیے ایک نوجوان لڑکا ہی کیوں؟ کوئی عورت بھی رکھی جا سکتی تھی۔ بظاہر کوئی ایسا کام بھی نظر نہیں آتا تھا جس کے لیے رانا صاحب کو کسی سیکرٹری کی ضرورت پیش آئے۔ میں غور کرتا رہا۔ اور پھر میرے لیے شام کی چائے آ گئی۔ ایک ملازمہ تھی جو خود بھی نوجوان تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جس میں چائے کے برتنوں کے ساتھ ڈرائی فروٹس کی پلیٹ بھی تھی۔ ملازمہ چائے رکھ کر خاموشی سے چلی گئی اور میں سنبھل گیا۔ یہ میرے ساتھ ملازمانہ برتاؤ کا پہلا مظاہرہ تھا۔ مجھے چائے میں اپنے ساتھ نہیں شریک کیا گیا تھا اور یہ بات اچھی ہی ہوئی۔ اس ماحول نے مجھے بھٹکا دیا تھا۔ لیکن اس چائے نے میرے حواس درست کر دیئے اور مجھے احساس ہوا کہ مجھے کھال ہی میں رہنا چاہیے۔ شمسہ کی بے تکلفی اور التفات سے کوئی غلط نتیجہ نہیں اخذ کرنا چاہیے اور اس سے مالک کی لڑکی کے تصور کے ساتھ ہی ملنا چاہیے۔

تقریباً چھ بجے شمسہ میرے کمرے میں گھس آئی۔

''آیئے مسعود صاحب! میں آپ کو بلیئرڈ دکھاؤں گی۔''

اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھے کوٹھی کے ایک دُور اُفتادہ حصے میں لے گئی۔ اور اب مجھے کئی ملازم اور دوسرے لوگ نظر آئے۔ سب خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بلیئرڈ روم کافی کشادہ تھا اور

وہاں اعلیٰ درجے کی بلیئرڈ ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ میں اس کھیل میں اناڑی تھا اور شمسہ کافی ماہر۔ وہ میرے اناڑی پن پر ہنستی رہی اور مجھے کھیلنا بتاتی رہی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے حیرت سے کہا۔

''آپ تو حیرت انگیز طور پر ذہین ہیں۔ بڑے اچھے شاٹ لگا رہے ہیں۔'' اور پھر کھیل میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہم دو گھنٹے تک کھیلتے رہے۔ پھر شمسہ ہی اُکتا گئی۔ میرے اوپر تو اس کی معیت کا سحر طاری تھا۔ چنانچہ میں نے بالکل تھکن نہیں محسوس کی۔ اس نے بلیئرڈ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔

''طویل عرصے کے بعد میں نے خوشی محسوس کی ہے، درحقیقت میں بہت خوش ہوں۔ اب کل ملاقات ہو گی۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے کہا اور شمسہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی۔ رات کے آٹھ بجے کھانا آ گیا۔ یہ کھانا بھی خاصا پُرتکلف تھا۔ لیکن میں نے تنہائی محسوس کی اور پھر دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ یہاں ملازمت کرنے آیا ہوں، مہمان بن کر نہیں آیا۔

وقت گزرتا رہا۔ اب میں یہاں کی محدود زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے شدید حیرت تھی۔ یہ کیسی ملازمت تھی؟ معلوم ایسا ہی ہوتا تھا جیسے مجھے صرف شمسہ کا دل بہلانے کے لیے بلایا گیا ہو۔ داور محمود سے میری دو تین بار ہی ملاقات ہوئی تھی انہوں نے ابھی تک مجھے کوئی کام نہیں دیا تھا۔ جب کہ میں سیکرٹری ان ہی کا تھا۔ بہرحال جب مالکان کی یہی خواہش تھی تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ویسے اس ماحول کا عادی ہو جانے کے باوجود یہاں کی کچھ باتیں ابھی تک میری سمجھ سے باہر تھیں۔ یہ لوگ نہ کہیں جاتے تھے نہ کوئی ان سے ملاقات کرنے آتا تھا۔ لیکن بعض اوقات جب میں اپنے کمرے میں ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے پوری کوٹھی ویران پڑی ہو۔ یہاں میرے علاوہ کوئی ذی روح کا وجود نہ ہو۔ ایک بار میں اس کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے سے نکل آیا اور درحقیقت پوری کوٹھی میں مجھے ایک فرد بھی نہیں نظر آیا۔ تھک ہار کر میں اپنے کمرے میں

واپس آ گیا۔ میں سخت حیران تھا آخر یہ لوگ کہاں چلے گئے؟ بہرحال اپنے کمرے میں، بند ہو کر میں ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کھیل کے وقت شمسہ میرے کمرے میں پہنچ گئی اور میں نے اس سے پوچھا۔

''سب لوگ کہاں چلے گئے تھے؟''

''اپنے اپنے کمروں میں ہوں گے، کیوں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''لیکن مجھے تو کوئی نہیں ملا۔''

''کیا تم نے تلاش کیا تھا؟'' شمسہ نے پوچھا۔

''ہاں......'' میں نے جواب دیا اور شمسہ کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر مسکراتے ہوئے کہا کہ آج وہ مجھ سے زبردست مقابلہ کرے گی۔ میں نے بھی زیادہ چھان بین مناسب نہیں سمجھی، لیکن میرے ذہن میں ایک چبھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں بلیرڈ میں شمسہ کا ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکا اور بہت جلد ہار گیا۔ شمسہ بھی میری اس کیفیت کو سمجھ رہی تھی، چنانچہ ایک دو گیم کے بعد ہی اس نے اسٹک رکھ دی۔

''اب کل کھیلیں گے، میرا خیال ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اوں، شمسہ کچھ گرانی محسوس کر رہا ہوں۔'' اور شمسہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں مسعود؟''

''شکریہ شمسہ، تمہاری یہ ہمدردی میرے لیے کافی ہے۔'' میں نے جذباتی ممنونیت سے کہا۔ یہ حقیقت تھی، بہرحال وہ لوگ میرے آقا تھے اور میں ملازم۔ وہ جس ہمدردی سے میرے ساتھ پیش آ رہے تھے میں اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ شمسہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی گفتگو کرتی رہی۔ آج میں نے اس کے انداز میں ایک خاص بات دیکھی تھی۔ عام دنوں میں وہ ایک الہڑ دوشیزہ تھی، ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنے دل شکن حسن اور قیامت خیز جسم کی حشر سامانیوں کا ذرا بھی احساس نہ تھا...... وہ بیباکی سے اپنے جسم کے پوشیدہ حصے عریاں کر دیتی تھی اور ایسے

مواقعوں پر میں ہی نظریں جھکا لیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فطرتاً معصوم ہے، لیکن آج اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت انگڑائی لیتے دیکھی تھی۔

''شکریے کی ضرورت نہیں ہے مسعود...... میں تمہارے اس قدر قریب آ گئی ہوں کہ اب میں تمہاری کسی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی ہوں۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں...... میں،'' اس نے گردن جھکا لی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

شمسہ کے لیے میرے دل میں بھی پسندیدگی کے جذبات تھے۔ بحیثیت لڑکی میں نے اسے بغور دیکھا تھا اور دل کے گوشوں میں اس کے حسن کے نقوش محفوظ کر لیے تھے، لیکن اس سے آگے بڑھنے کے معاملے میں، میں نے دل سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میں نے خود سے کہا تھا کہ مجھے اپنی حیثیت سے نہ بڑھنا چاہیے میں ملازمت کرنے آیا ہوں، ملازمت کروں اور بس۔ اگر میری کسی حرکت سے یہ ملازمت بھی چھوٹ گئی تو اس کے بعد کا تصور بے حد خوفناک تھا۔

چنانچہ شمسہ کے ان الفاظ میں کھو جانے کے بجائے میں نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

''میں محسوس کرتا ہوں محترمہ شمسہ! آپ بے حد مہربان اور صاف دل خاتون ہیں، میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔''

شمسہ نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، صرف عزت؟ اور میں ان نظروں کے جواب میں آنکھیں جھکا لینے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ شمسہ خاموشی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ لیکن اسی رات میں سکون سے نہ سو سکا۔ شمسہ کی آج کی کیفیت جہاں میرے دل کو گدگدا رہی تھی، وہیں مجھے اپنے مستقبل کا بھی خوف تھا۔ میں نے محنت و مشقت میں آنکھ کھولی تھی اور اس کے بعد حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ میرے اوپر جوان بہن کی ذمہ داری تھی، بوڑھے والدین کا احساس تھا۔ رومان جیسی چیزوں کی میری زندگی میں گنجائش نہیں تھی۔ لیکن میں فطرت کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ میں نے خود کوشش نہیں کی تھی، لیکن شمسہ کے الفاظ نے میرا سکون چھین لیا۔ میرا دل چیخ چیخ کر اپنا حق طلب کر رہا تھا اور وہ رات سخت کشمکش میں گزری، لیکن دوسری صبح میں پرسکون تھا۔

اس روز میری محمود رانا صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے

کمرے میں لے گئے۔

''بیٹھو مسعود......!''

انہوں نے نرم آواز میں کہا اور میں شکریہ ادا کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم بھی سوچتے ہو گے یہ کیسی ملازمت ہے نہ کام نہ کچھ۔ میرا خیال میں اس سلسلے میں وضاحت کر دوں۔'' میں خوفزدہ نظروں سے رانا صاحب کو دیکھنے لگا۔

''گھر کے ماحول پر جمود سا طاری تھا' دوسرے تمام لوگ تو اپنے اپنے کاموں میں مگن ہیں لیکن شمسہ نوجوان ہے' اس کے ذہن میں ابھی بچپن ہے' میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں' چنانچہ صحیح معنوں میں' میں نے تمہیں اس کے لیے رکھا ہے' مجھے مسرت ہے کہ تم نے شمسہ کی توقعات پوری کر دی ہیں اور میں اسے خوش دیکھ رہا ہوں' میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ اسی طرح خوش رہے اور یہی تمہاری ذمہ داری ہے۔ ویسے شمسہ کی سفارش پر تمہاری تنخواہ ڈبل کر دی گئی ہے' یعنی اب تم آٹھ ہزار روپے ماہوار وصول کرو گے۔''

میرا خوف مسرت میں تبدیل ہو گیا' لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خلش سی تھی شمسہ نے کل جس خیال کا اظہار کیا تھا اگر میں اس کی پذیرائی کرتا تو غداری کا مرتکب ہوتا۔ اس سلسلے میں رانا صاحب سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس میں میرے دو نقصان تھے۔ رانا صاحب مجھے ملازمت سے فوراً نکال سکتے تھے اور پھر شمسہ کی سفارش بھی کام نہ آتی۔ مجھے صرف اپنی ملازمت بچانی تھی' اس لیے میں خاموش ہی رہا...... اور رانا صاحب نے مزید کچھ گفتگو کے بعد مجھے رخصت کر دیا۔

اس شام شمسہ میرے پاس نہیں آئی' ورنہ روزانہ وہ مجھے بلانے آ جاتی تھی' میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا اور جب خاصی دیر گزر گئی' تو میں خود اس کی طرف چل پڑا۔ شمسہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا بلیئرڈ روم کی طرف پہنچا۔ شمسہ وہاں موجود تھی۔ وہ بلیئرڈ ٹیبل سے ٹکی ہوئی خلا میں گھور رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار تھے۔

''مس شمسہ'' میں نے اسے آواز دی اور وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے

لگی۔ ''آپ ناراض ہیں؟'' میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا اور میرے لہجے کی لرزش نے شاید اسے متاثر کیا۔

''ہاں......'' وہ بولی۔

''میں آپ سے معافی چاہتا ہوں مس شمسہ۔''

''کس بات کی؟'' وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔

''میری جس بات سے آپ ناراض ہوئی ہوں؟''

''میں تو سوچ رہی تھی کہ...... میں تو...... اپنی شکست پر شرمندہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں' مجھے خود پر افسوس ہے کہ میں نے یہ معلوم کیے بغیر آپ کو کیوں پسند کیا......؟ میں اپنے آپ پر شرمندہ ہوں۔''

''مس شمسہ' میری زندگی محرومیوں کی داستان ہے۔ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی' اس میں رومان کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے اب تک جدوجہد میں وقت گزارا ہے' چنانچہ کسی اور کو پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے پہلی بار مجھے پسند کے لفظ سے آشنا کرایا ہے۔ میں اس بات پر اپنی قسمت پر نازاں ہوں۔ لیکن میری محرومیاں مجھے خوف زدہ کر رہی ہیں۔''

پورے ایک سال کے کرب کے بعد آپ لوگوں کی خوشگوار چھاؤں ملی ہے میں اس سائے سے محروم ہونا نہیں چاہتا' مالکوں کی برابری کی کوشش نے آج تک کسی کو کچھ نہیں دیا ہے۔ میری بے بسی مجھے مجبور کر رہی ہے' ورنہ میرے ذہن میں آپ کے نقوش جڑ پکڑ چکے ہیں۔''

شمسہ میرے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور جب وہ میری بات سمجھ گئی' تو اس کا چہرہ پھولوں کی طرح کھل اُٹھا۔

''ڈیڈی نے شائد یہ بات آپ کو نہیں بتائی کہ انہوں نے صرف میری تنہائی دور کرنے کے لیے آپ کو بلایا ہے۔ ہم سب لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں اور...... ڈیڈی کو ہمارے کسی بھی معاملے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ میرا قول ہے۔ اگر آپ ملازمت سے خوف زدہ ہیں تو میں اس کی ضمانت دیتی ہوں' ویسے بھی آپ کی پریشانیاں دور کرنا

ہمارا فرض ہے۔ آپ نے آج تک اس موضوع پر گفتگو ہی نہیں کی تھی۔''

''اگر یہ بات ہے مس شمسہ تو مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ کو پسند کرتا ہوں۔'' میں نے جانے کس طرح یہ الفاظ ادا کیے اور شمسہ بے خود ہوگئی' اس کے خوبصورت بال میرے سینے پر پھیل گئے اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کئی منٹ بے خودی کے عالم میں گزر گئے، پھر وہ سنبھل کر بولی۔

''آیئے' پھر کھیل ہو جائے' آج میں دل سے کھیلوں گی۔''

''میں کھیل سے قبل ہار تسلیم کرتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''آپ سے ہار کر جس قدر خوشی ہوتی ہے' جیت کر نہیں۔ جیتنے کے بعد آپ کے رخساروں کی شفق دنیا کا سب سے حسین نظارہ ہوتی ہے۔''

''بڑی خوبصورت باتیں کرتے ہیں آپ...... آیئے۔'' اور کھیل شروع ہوگیا۔

کھیل شروع ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ آٹھ ہزار روپے میرے گھر پہنچ گئے تھے جس کی رسید مجھے دے دی گئی۔ میں نے اپنے والدین سے ملنے کے لیے چھٹی مانگی جو رانا صاحب نے منظور کر لی لیکن شمسہ کو میری جدائی گوارا نہیں تھی اور میں بھی اسے نہ چھوڑ سکا۔ ویسے اس نے درست کہا تھا۔ حویلی کے کسی بھی فرد کو ہم لوگوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سب بے تعلق تھے۔ آج تک میں نے ان لوگوں کو کسی شغل میں دلچسپی لیتے دیکھا ہی نہیں تھا سب گم سم' خاموش۔ وہ مجھے نظر ہی بہت کم آتے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں رہتے تھے' کوئی ضرورت ہوتی تو باہر نکل آئے' ورنہ...... میرے لیے وہی اصول برقرار تھا۔ تینوں وقت ناشتا، کھانا اور چائے وغیرہ میرے کمرے میں ہی آ جاتی تھی...... کبھی میں نے کسی کو حویلی سے باہر جاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں شاید کافی مقدار میں موجود تھیں۔ شمسہ میرے بہت قریب آ گئی تھی اور اب ہمارا تمام دن ہی ساتھ گزرتا تھا۔ اس وقت جب ملازمہ میرے لیے کھانا لائی تو شمسہ میرے کمرے ہی

میں موجود تھی ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی اور پھر شمسہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم کھانا کھاؤ' کھانے کے بعد آؤں گی۔'' شمسہ نے کہا۔

''شمسہ' میں نے نہ جانے کس جذبے سے کہا۔ اور وہ رک گئی۔

''شمسہ تم نے میرے اور اپنے درمیان تمام تکلفات دور کر دیئے ہیں' لیکن ایک تکلف ابھی قائم ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس وقت ہم دونوں ساتھ ہی کھانا کھائیں۔'' میری دانست میں یہ معمولی بات تھی اور مجھے یقین تھا کہ شمسہ میری بات فوراً مان لے گی' لیکن میں نے دیکھا کہ شمسہ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے' وہ عجیب انداز میں میری شکل دیکھ رہی تھی اور میں اس کی اس حالت پر حیران تھا۔

''اگر میں اس سے انکار کر دوں تو تمہیں دُکھ ہوگا مسعود؟''

''ہاں شمسہ' میں دوسرے لوگوں کے لیے تو کچھ نہیں کہہ سکتا' لیکن تم پر تو اب میرا حق ہوگیا ہے...... میں تمہیں اس کے لیے مجبور کر سکتا ہوں۔''

''تمہیں میرے اوپر پورا پورا حق ہے مسعود...... لیکن تمہیں اس حق کا خراج ادا کرنا ہوگا۔ میں آج رات تمہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کر دوں گی اور آج رات تم ہمیشہ کے لیے میرے ہو جاؤ گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی۔''

میں شمسہ کی کوئی بات نہیں سمجھ سکا تھا' چنانچہ میں بولا۔

''میں ہر خراج ادا کرنے کو تیار ہوں لیکن اس وقت تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا۔''

''ہم لوگ کھانا نہیں کھاتے مسعود ہم میں سے کوئی کچھ نہیں کھاتا' اس گھر میں کھانا صرف تمہارے لیے آتا ہے ہم اس چکر سے مبرّا ہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور میں شمسہ کے چہرے پر سنجیدہ مذاق تلاش کرنے لگا۔ ظاہر ہے یہ بات عقل سے باہر تھی۔

''میں نہیں سمجھ سکا شمسہ۔'' آخر میں نے کہا۔

''میری درخواست ہے' اس وقت کچھ نہ سمجھو' کھانا کھا لو' میں گیارہ بجے تمہارے

پاس آؤں گی اور پھر ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ایک ایسا دور جس میں شادمانیاں ہوں گی' اجازت دو مسعود صرف گیارہ بجے تک کے لیے...... پلیز!''

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئی۔ میں کافی دیر تک غور کرتا رہا' لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ لوگ کھانا نہیں کھاتے پھر زندہ کیسے ہیں؟ میں نے سوچا اور پھر میں نے اس بات کو شمسہ کی ظرافت پر محمول کیا۔ وہ بعض اوقات سنجیدگی سے مذاق کرتی تھی اور مجھے زچ کر دیتی تھی۔

مجھے گیارہ بجے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے جامد ہو گئی تھیں۔ خدا خدا کر کے گیارہ بجے اور ٹھیک گیارہ بجے شمسہ نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی تھی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور میری طرف مڑی حسب معمول اس کے جسم پر ایک چست اسکرٹ تھا جو گھٹنوں سے اُونچا تھا اور اس کی سڈول رانیں نمایاں تھیں۔ خاص انداز میں ترشے ہوئے سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے' لیکن اس وقت صرف ایک بات مختلف اور میرے لیے حیرت انگیز تھی' کہ اس کی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی میں ایک لمبا اور نوک دار خنجر اڑسا ہوا تھا جس کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ تاہم میں سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔

''مسعود۔'' اس کی سرسراتی آواز سنائی دی۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''بے پناہ۔''

''میری محبت کا خراج ادا کرو گے؟''

''دل وجان سے۔''

''وعدہ کرتے ہو؟''

''وعدہ۔''

''مجھے تم پر اعتماد ہے میرے محبوب اور آج میں اپنے راز سے تمام پردے ہٹا

رہی ہوں۔ آج میں تمہیں ہمیشہ کے لیے حاصل کروں گی اور ہمارے درمیان کوئی دوری نہیں رہے گی' کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے ڈرالنگ؟'' میں نے محبت سے کہا۔

''تو سنو! آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی بات ہے قصبہ رتولی اس وقت قصبہ نہیں' ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور یہ گاؤں میرے ڈیڈی یعنی داور محمود کی ملکیت تھا۔ ہم لوگوں نے گاؤں سے باہر خوبصورت حویلی بنوائی تھی۔ میں نے شہر میں زندگی گزاری تھی اور اس وقت میں انیس سال کی تھی جب گرمیوں کی چھٹیوں میں مَیں شہر سے یہاں آئی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اچانک گاؤں میں پلیگ پھیل گیا۔ ہمارا پورا گھرانہ پلیگ کا شکار ہو گیا اور ہم سب چند گھنٹوں کے فرق سے مر گئے۔ امدادی جماعتیں جب یہاں پہنچیں تو گاؤں میں چند افراد ہی زندہ بچے تھے۔ پھر یہ گاؤں بالکل اُجڑ گیا اور پورے بیس سال کے بعد یہ دوبارہ آباد ہوا۔ اب ایک قصبے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ہم لوگ اُسی وقت سے اس عمارت میں رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے الگ تھلگ۔ کیوں کہ اب زندہ لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں زندگی سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ نہیں کھاتے پیتے' میں نوجوان مری تھی میرے دل میں آرزوئیں تھیں اور میرے ڈیڈی کو میری اُداسی بہت بُری لگتی تھی' چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ شہر سے کسی زندہ نوجوان کو یہاں لے آئیں اور میں اس سے رابطہ بڑھا لوں' اگر وہ مجھے پسند کرنے لگے تو پھر میں اسے بھی مرنے کی دعوت دوں اور وہ اگر میرے لیے مرنے کو تیار ہو جائے تو پھر مرنے کے بعد میں اسے ابد تک کے لیے اپنا لوں۔ میں نے تمہیں اور تم نے مجھے پسند کر لیا ہے مسعود۔ تمہارے آنے کے بعد ڈیڈی نے تجویز پیش کی کہ تمہیں خوراک میں زہر دیا جائے تاکہ تم اس سے مر جاؤ لیکن میں نے اس سے اختلاف کیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ پہلے میں تمہیں مرنے کے لیے آمادہ کر لوں اور پھر خود تمہیں قتل کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا لوں۔ وہ وقت آ گیا ہے میرے محبوب۔

آج تمہاری زندگی کی آخری رات ہے...... اور پھر...... ہمارے تمہارے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہے گی۔''

''یہ کیا مذاق ہے شمسہ؟'' میں نے ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں محسوس کیں۔ گو مجھے شمسہ کے اس مذاق پر یقین نہیں آیا تھا' لیکن یہاں کا ماحول اور شمسہ کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے بھی شبہ سا ہونے لگا۔

''مذاق نہیں مسعود' یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے' کیا تم نے میرے جسم میں زندگی کی حرارت محسوس کی ہے؟ میں زندہ نہیں ہوں مسعود'' اور میرا شبہ حقیقت میں بدلنے لگا۔ میں نے کئی بار شمسہ کے جسم کے بارے میں بھی سوچا تھا۔

''مجھے میری محرومیوں سے نکال لو مسعود' میری طویل زندگی کو مسرتوں سے ہمکنار کر دو۔ آج میں تمہیں اپنا بنائے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔'' شمسہ نے پیٹی میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا اور میری طرف لپکی۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اب میں بھی گومگو کی حالت میں تھا۔ لیکن شمسہ نے وار کر دیا اور خنجر کی نوک میرے کوٹ میں داخل ہو کر شانے کو زخمی کر گئی۔

اس زخم کے بعد خود فریبی کی گنجائش نہیں تھی۔ میرے جسم سے پسینہ بہہ نکلا اور میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن شمسہ نے پاؤں اڑا کر مجھے گرا دیا اور مٹھی میں خنجر دبائے ہوئے میرے اُوپر جھکی۔ میری آنکھوں میں موت ناچ رہی تھی۔ میں نے زندگی کی آخری کوشش کی اور شمسہ کی پنڈلی پکڑ کر اسے زور سے دھکا دیا۔ میری کوشش کامیاب رہی اور نازک اندام شمسہ زور سے نیچے گری۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا...... اور دروازے سے نکل کر بے تحاشا بھاگنے لگا۔ داور محمود شائد میرے دوڑنے کی آواز سن کر ہی کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے مسعود؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''وہ، وہ شمسہ...... نہ جانے اس پر کیسی دیوانگی کا دورہ پڑا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتی ہے' وہ کہہ رہی ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے' وہ مجھے قتل کر کے اپنانا چاہتی ہے۔'' میں

نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا اور داور محمود نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''وہ درست کہہ رہی ہے بیٹے' اس نے جو کچھ کہا ہے درست کہا ہے۔ میری درخواست ہے کہ تم اس کی خواہش پوری کر دو۔''

''مم۔مم۔مگر میں زندہ رہنا چاہتا ہوں' میں اپنے والدین، اپنی بہن کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے بچایئے۔'' میں نے کہا۔

''بچی کا شوق ہے' اس کی خواہش ہے' بیٹے' میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا' مجھے افسوس ہے۔'' داور محمود نے کہا۔ اسی وقت راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی شمسہ کی چیختی ہوئی آواز۔

''جانے نہ پائے ڈیڈی۔ یہ بچ کر نکل گیا تو' پھر...... تو پھر......'' اور داور محمود میری طرف لپکا۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسہ داور محمود کے منہ پر رسید کیا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پھر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کس رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ شمسہ کی چیخیں مجھے دھرم شالہ تک سنائی دیتی رہیں' وہ کہہ رہی تھیں۔

''رک جاؤ مسعود...... رُک جاؤ مسعود...... میرے مسعود...... میرے محبوب۔''

رتولی تک میں اسی قوت سے دوڑتا رہا۔ میرے شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس کا ہوش نہیں تھا۔ رتولی پہنچ کر میں نے سانس لیا اور پھر بہ ہزار دقت اپنے والدین کے پاس پہنچ سکا۔ یہاں کچھ اور حیرتیں میری منتظر تھیں۔ میرے والدین عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں پانچ پانچ ہزار روپے کے دو منی آرڈر ملے تھے اور آٹھ ہزار کا ایک۔ پانچ پانچ ہزار کے منی آرڈر کسی شمسہ داور نے بھیجے تھے۔''

میرے شانے کے زخم کے علاج میں کئی ہفتے لگ گئے۔ ویسے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ والدین سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور والد صاحب ناراض تھے کہ اس قدر عمدہ ملازمت کیوں چھوڑ دی۔

فی الوقت مجھے ملازمت کی زیادہ پریشانی نہیں تھی' لیکن فکر ضرور تھی اور آج

''ضرورت ہے'' کے کالم میں یہ اشتہار دیکھ کر پھر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''ضرورت ہے۔ ایک پرائیویٹ سیکرٹری کی' نوجوان اور ذہین انسان کو ترجیح دی جائے گی' خوش شکل اور خوش پوش ہونا ضروری ہے' معقول تنخواہ پیش کی جائے گی۔ ضرورت منداس پتے پر رجوع کریں۔

ٹوٹا دروازہ۔ بنگلا نمبر چھتیس

ڈی۔ایم۔رانا''

☆......☆......☆

یہی ہے زندگی

دونوں احمق تھے جو مجھے دنیا میں لانے کا باعث بنے۔ نقصان بھی خود ہی اُٹھایا، میرا کیا قصور ہے، میری فطرت ہی ایسی ہے۔ میری مرضی کے خلاف کوئی کام کیا جائے یا مجھ سے کرانے کی کوشش کی جائے تو میں حواس میں نہیں رہتی۔ میں نے خود بھی بارہا اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچا ہے، اب یہ کوئی بہت بڑا ذہنی ماہر ہی بتا سکتا ہے کہ میرے دماغی خلیوں میں کیا گڑبڑ ہے؟ کیوں میں ایسی سیماب صفت اور آتش ذہن ہوں۔

جس روز میری ماں نے نویں مہینے کا آخری دن پورا کیا، اس روز بھی شاید میرا دنیا میں آنے کا موڈ نہیں تھا لیکن خاتون نے نو مہینے پورے کر لیے تھے اور مزید ایک دن گزارنے کے لیے تیار نہیں تھیں جب وہ ضد پر آمادہ تھیں اور ہر قیمت پر پیٹ خالی کر دینا چاہتی تھیں تو پھر میں ہی کیوں تیار ہوتی چنانچہ ہم دونوں میں کش مکش ہونے لگی۔ والدہ صاحبہ میری کمزوری اور ناسمجھی سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھیں، لیکن میں بھلا شکست تسلیم کرنے والی تھی؟ نتیجے میں لیڈی ڈاکٹر کو میری ماں کا پیٹ چاک کرنا پڑا اور خاتون ضد ہی ضد میں جان دے بیٹھیں۔ رہ گئے قبلہ ابو جان، تو وہ صلح جو آدمی تھے، کبھی ضد نہ کرتے اور میری خواہشات کے سامنے سر جھکاتے رہتے' اس لیے میری ان سے نبھ گئی۔ بچپن کی حدود سے نکلی، نہ جانے کتنے ہنگاموں نے جنم لیا تھا۔ نہ جانے کتنی بار میرے والد کو میری وجہ سے پریشانیوں میں گرفتار ہونا پڑا تھا اس کا حساب وہی رکھتے

ہوں گے، مجھے کیا پڑی ہے جو ساری باتیں یاد رکھوں۔ ہاں اساتذہ نے مجھ سے بہرحال تعاون کیا تھا، یوں بھی حصولِ علم کا شوق مجھے حد سے زیادہ تھا۔ بس میں مخالفت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کے بے شمار علوم وفنون سے متعلق کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں، جو چیز من کو بھا جاتی، اس کے حصول کے لیے کوشاں ہو جاتی اور بہرحال اگر تقدیر کا کوئی وجود ہے تو میری تقدیر بہت اچھی ہے، کیونکہ مایوسیاں اور ناکامیاں مجھ سے بہت دور رہتی ہیں۔ شاید انہیں بھی میرے مزاج کا اندازہ ہے۔

قصہ مختصر، یہ میری مزاجی کیفیت تھی۔ زندگی کے سترہویں سال تک کچی عمر کی کچی باتیں رہیں، میرے سوچنے کا انداز بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ بہت سی لڑکیوں، بہت سے لڑکوں نے میرا دوست بننے کی کوشش کی، میں نے ان میں سے چند کی پذیرائی بھی کی، لیکن ذہن کے اندرونی گوشوں میں ایک اضطراب کروٹیں لیتا رہتا تھا، ایک انوکھا احساس، یہ سب کچھ، سب کچھ، نہیں ہے، کچھ اور ہے جس کی تلاش ضروری ہے، لیکن کہاں؟ اور میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا، کتابیں۔

میں نے دنیا بھر کی کتابیں خرید ڈالیں، ہر موضوع پر۔ ہر فن پر اور پھر پورے دو سال میں نے کتابوں میں گزارے، سب کچھ چھوڑ دیا میں نے، دوست، احباب، سب کچھ۔ میں ان کتابوں میں اپنا مستقبل، اپنے اضطراب کا حل تلاش کر رہی تھی۔ میری عادت تھی جو کتاب مجھے متاثر نہ کرتی، میں اسے ضائع کر دیتی، جلا دیتی۔ اس کے لیے میری لائبریری کے شیلف میں کوئی جگہ نہ رہتی اور...... پورے دو سال کے بعد جب میں نے اپنی لائبریری پر نگاہ ڈالی تو اس میں چاروں طرف صرف ایک ہی موضوع کی کتابیں سجی ہوئی تھیں، یہ وہ کتابیں تھیں جو مجھے پسند آئی تھیں اور ان کا موضوع تھا، جرائم، ایڈونچر۔ میں چونک پڑی۔ سچ مچ، گویا دو سال تک میں نے اپنا امتحان لیا تھا اور یہ کتابیں اس کا نتیجہ تھیں۔

تو کیا یہ زندگی دلکش ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا، سوچا، خوب غور کیا ہاں۔ زندگی ایک جگہ محدود نہیں ہونی چاہیے، تحریک ہی زندگی کی دوسری شکل ہے، میں قید کیوں کہوں، کوہ دماوند کے پہلو میں واقع تہران کی جنت شمرون کا یہ خوبصورت مکان

مجھے کیوں محدود کیے ہوئے ہے؟ سروں پر چھایا ہوا نیلا سمندر تو جہان جہان کی کہانیاں سناتا ہے، پھر میرا جہان تہران کے زیریں شہر سے دو ہزار فٹ بلند اس جگہ تک کیوں محدود ہے؟ آقائے عباس دونیدی، خود کو میرا مالک کیوں بنائے ہوئے ہیں، ٹھیک ہے وہ میرے باپ ہیں، لیکن ایک زندگی وجود میں آچکی ہے، اس کی اپنی سوچ ہے، اس کا اپنا بدن ہے، پھر اس بدن پر قید کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ تو مناسب نہیں ہے۔

چنانچہ ایک شام میں نے اس موضوع پر اپنے والد صاحب سے گفتگو کرنے کا ارادہ کیا، لیکن نہ کر سکی، کیونکہ اسی شام کچھ مہمان مشہد سے آگئے، میرے لیے اجنبی تھے، لیکن والد صاحب نے تعارف کرایا۔

یہ میری بیٹی شاہ رخ ہے اور شاہ رخ! یہ شہر یار ملّی ہیں، ریشم کے بہت بڑے تاجر اور میرے دوست، یہ ان کی اہلیہ اور یہ نوجوان ہارون ملّی ہے، شہر یار ملّی کا اکلوتا بیٹا اور انتہائی ذہین کاروباری، یوں سمجھو شہر یار کو کچھ نہیں آتا، ہارون صاحب نے اس کے کاروبار کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

والد صاحب شہر یار سے بہت بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ سب ہنسنے لگے میں نے بھی مسکرانا ضروری سمجھا۔ یہ لوگ ہمارے یہاں قیام کے لیے آئے تھے چونکہ ہمارے مکان میں کافی وسعت تھی۔ اس چھوٹی سی فیملی کے لیے مناسب بندوبست کر دیا گیا۔ ہارون ملّی بزلہ سنج اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ شام کو بلیئرڈ ٹیبل پر وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر اس نے میرے بارے میں اپنی پسند کا اظہار کر دیا اور تیسرے گھنٹے میں اظہارِ محبت۔

میں ان احمقانہ جذبات سے ناواقف نہیں تھی۔ دورانِ تعلیم بھی چند لڑکوں نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی، لیکن میں ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کر سکی، اس لیے بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی اور پھر ظاہر ہے پوری درسگاہ میں صرف میں ہی حسین لڑکی نہیں تھی۔ دوسری بھی تھیں، چنانچہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے، ہاں رقابت یا نفرت کے جذبات میرے سینے میں نہیں بیدار ہوئے تھے اور بہرحال یہ بات مجھے عام لڑکیوں سے ہٹا دیتی تھی۔

تو بات ہارون کی تھی، اس کے اظہارِ محبت کا میں نے بُرا نہیں منایا۔ چونکہ اس کی شخصیت پسند آئی تھی، اس لیے میں نے اس کی پذیرائی بھی کی۔ پھر دوسرے دن میں نے اسے تہران کے نواح دکھائے، خیابان ناصر خسرو سے میدانِ سپاہ اور پھر خیابان فردوسی، جہاں فردوسی کا مجسمہ شاہنامہ ہاتھ میں تھامے تہران کی نگرانی کرتا ہے۔ پھر گلستان پیلس میں تختِ طاؤس دیکھا، اور پھر بلیووارڈ نو پہنچ گئے، جہاں ایک اوپن ریستوران میں بیٹھ کر ہم نے بھنے ہوئے مرغ کے ساتھ آب جو خنک پیا اور آب جو کے چار ٹھنڈے گلاس چڑھانے کے بعد ہارون ملّی نے اصلیت اُگل دی۔

''شاہ رخ، آپ۔ آپ مجھے بیحد پسند آئی ہیں۔''

''شکریہ ادا کرتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں آج رات کو ہی والد محترم سے گفتگو کرلوں گا، کیا آپ مجھے اپنی زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے پسند کریں گی؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہم لوگ اسی لیے مشہد سے یہاں آئے ہیں۔ غالباً والد محترم اور آپ کے والد صاحب کی بات ہو چکی ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کو پسند کریں تو ہمیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔''

میں خاموش ہوگئی، میرے ذہن میں شادی شدہ لوگوں کی زندگی اُبھر آئی، انوکھے تجربات ہوتے ہوں گے، کیا یہ زندگی اجنبی نہیں ہے؟ میرا خیال ہے دلچسپ ہوتی ہوگی، ورنہ یہ لوگ کیسے پوری زندگی گزار دیتے ہیں، میں نے سوچا کیا حرج ہے، ایک تجربہ ہی سہی۔

''آپ کی کیا رائے ہے مس شاہ رُخ! اگر آپ کا عندیہ معلوم ہو جائے تو میرے لیے کوئی اُلجھن نہ رہے۔''

آپ ایک اچھے نوجوان ہیں ہارون، مجھے پسند ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور ہارون کِھل اُٹھا۔ اور پھر بات آگے بڑھ گئی، وہ لوگ تین روز رہ کر واپس چلے گئے، پھر آئے اور میں ہارون سے منسلک ہوگئی، میں اس کے ساتھ مشہد چل

پڑی۔ ہارون اور اس کے والدین بے حد خوش تھے، میں بھی مسرور تھی۔ ہارون کا مکان بھی بُرا نہیں تھا، نہایت پُرفضاء مقام پر واقع تھا۔ چونکہ سولہ گھنٹے کا سفر کرنا پڑا تھا، اس لیے ابھی تک مجھے اور ہارون کو تنہائی نہیں مل سکی تھی، اور آج حجلہء عروسی کی پہلی رات تھی۔

میرے ذہن میں ایک عجیب سی خلش بیدار ہوگئی تھی، ابھی تک تو کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی تھی، کوئی ایسی بات جو سکون و اطمینان کا باعث ہوتی یا کوئی ایسی بات جو ذہن و دل میں کوئی سنسنی خیز تحریک پیدا کرتی اور کسی انوکھے پن کا احساس ہوتا، فضول سی رسمیں ہوئی تھیں، جن میں کوئی دلکشی نہیں تھی، بیزاری کا دُھواں میرے ذہن تک پہنچ رہا تھا اور ایک عجیب سی نفرت اُبھرتی آ رہی تھی، کوئی فائدہ تو ہوا نہیں، سوائے حماقت کے، کہیں یہ حماقت کوئی بہت بڑی اُلجھن نہ بن جائے، ہارون کی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں، لیکن اس دلچسپی کی ایک حد ہے، اس کے بعد ان کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، فضول کر لی میں نے شادی۔ بس حماقت کی، لیکن یہ حماقت برقرار نہیں رہنا چاہیے۔

تنہا کمرے میں خیالات کا دُھواں گھٹتا جا رہا تھا اور پھر ہارون آ گیا ایک عمدہ لباس میں تھا اور کافی خوبصورت نظر آ رہا تھا، لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت کوئی احساس قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں ہارون کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے سکی۔

''خیریت، شاہ رُخ! تم بہت سنجیدہ ہو؟'' ہارون نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور ہارون میرے بالکل نزدیک آ کھڑا ہوا۔

''تمہارا چہرہ بے حد سپاٹ ہے، میں اس پر جذبات چاہتا ہوں شاہ رُخ! کیا تم مجھے اس سنجیدگی کے بارے میں نہ بتاؤ گی؟''

''کوئی بات نہیں، بس مجھ سے حماقت ہوئی ہے۔'' میں نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیسی حماقت؟''

"مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی، کوئی خاص چیز نہیں ہوتی، فضول سی رسمیں، بیکار سی باتیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو شاہ رُخ، اس انداز میں مت سوچو۔ اصل زندگی تو اب شروع ہوئی ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے......"

ہارون نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے یہ زندگی پسند نہیں آئی اور بہر حال میں اسے گزارنے پر مجبور نہیں ہوں۔"

"میری بات تو سنو شاہ رُخ، نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہی ہو، ہمیں شادی سے پہلے یہ سب کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، میں تمہارا شوہر ہوں، میرے احکامات ماننا تمہارا فرض ہے۔" ہارون کے لہجے میں بھی تھوڑی سنجیدگی آ گئی اور یہ سنجیدگی میرے لیے اجنبی تھی، یہ الفاظ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔

میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "مجھے تمہارے احکامات ماننا ہوں گے؟" میں نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔"

"گویا تم سے کمتر ہوں۔"

"اوہ، شاہ رُخ...... شاہ رُخ! ایسی باتیں نہ کرو، یا تو تم انتہائی معصوم ہو یا پھر عجیب سی فطرت کی مالک، آؤ ان باتوں کو چھوڑو، ہمیں زندگی کی سب سے اہم حقیقتوں سے روشناس ہونا چاہیے، آؤ۔" اس نے اپنے انداز میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور اپنے بازو میرے بدن کے گرد لپیٹ دیئے، پھر قوت صرف کر کے مجھے فوم کے ڈھیر پر ڈال دیا اور خود بھی میرے اوپر لد گیا۔ اس کے ہاتھ میرے لباس کی بندشیں کھول رہے تھے۔ لیکن میرا ذہن اس کے ہاتھوں کی جنبش کی طرف نہ تھا، میں نے غور نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، میرے دماغ میں تو لمبے لمبے نوکدار پاؤں والے کنکھجورے رینگ رہے تھے اور مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

"اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا، میرے احکامات ماننا تمہارا فرض ہے، اب تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔"

لیکن کیوں نہیں ہوسکتا، میں نے ذہن جھٹک کر سوچا، میں بے بس ہوں کیا؟ میں نے نفرت زدہ نگاہوں سے ہارون کو دیکھا، اس کے ہونٹوں کی نمی مجھے اپنے بدن کے مختلف حصوں پر محسوس ہو رہی تھی، مجھے سخت کراہیت ہونے لگی۔ مجھے لگا جیسے دماغ میں رینگنے والے گندے کیڑے میرے بدن تک آ پہنچے ہوں، ہارون کے گھنگھریالے چمکدار بال میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ مَیں وحشت زدہ نگاہوں سے اس کے جنبش کرتے ہوئے سر کو دیکھتی رہی پھر میں نے پُر اضطراب نگاہوں سے اطراف میں دیکھا، مسہری کے ساتھ "وِیراس" کا خوبصورت مجسمہ رکھا ہوا تھا، پیتل کا وزنی مجسمہ، جس کے سر پر چھ لمبی نوکوں کا ستارہ بنا ہوا تھا، میرے ہاتھ تشنجی کیفیت میں اس کی طرف بڑھے اور وزنی مجسمہ میری اُنگلیوں کی گرفت میں آ گیا۔ میرا ہاتھ بلند ہوا پھر جُھکا اور ایک دلدوز چیخ میرے سینے کی نرماہٹوں میں بھنچ گئی۔ ہارون کے قوی بدن کی لرزشیں میرے جسم کے مختلف حصوں کو کچلنے لگیں، لیکن وہ اپنا سر میرے سینے سے نہیں ہٹا سکا۔ گرم گرم خون کی لکیریں میرے بدن پر رینگ رہی تھیں، ان لکیروں سے ایک انوکھے سرور کا احساس ہونے لگا۔

چند ساعت میں اس سرور میں ڈوبی رہی، پھر میں نے ہارون کے ساکت بدن کو خود پر سے دھکیل دیا، اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ کمبخت ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گیا تھا، اس کے مردہ بدن کو دیکھ کر ایک عجیب سی لذت میرے بدن پر طاری ہو گئی۔ مجھے سیسل روڈ کی وہ تاریخ دان دلہن یاد آ گئی، جس نے ایک تاریخی گتھی سلجھانے کے لیے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا، آہ کیسا دلچسپ مشغلہ ہے خوبصورت نوجوان سے شادی کرو اور پھر انہیں قتل کر دو۔

کیف و سرور سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں، لیکن بہر حال میں بہت جلد سنبھل گئی، ہارون کی لاش میرے نزدیک پڑی ہوئی تھی اور لاشوں کا قرب بہر حال خوشگوار نہیں ہوتا۔ اتنا جانتی تھی صبح کو سب کو ہارون کی موت کی اطلاع ہو جائے گی اور اس کے بعد ضروری کارروائیاں ہوں گی، پولیس کا چکر چلے گا اور مجھے اطمینان سے گرفتار کر لیا جائے گا، اس کے بعد بات سزائے موت تک پہنچ سکتی

ہے، چنانچہ مجھے اپنا بندوبست کرنا چاہیے۔ درحقیقت رگ و پے میں ایک سرور انگیز سنسنی دوڑ رہی تھی۔ وہ شروع ہو چکا تھا جس کے بارے میں سوچتی تھی، اس زندگی میں قدم رکھ چکی تھی جو مجھے پسند تھی۔ چنانچہ اب پوری ذہانت سے کام لے کر خود کو محفوظ بھی رکھنا تھا۔

چنانچہ میں بستر سے اُتر آئی، دلہن والا لباس پڑا ہوا تھا، لیکن اس احمقانہ لباس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، میرے دوسرے لباس بھی موجود تھے، میں نے ان میں سے ایک سادہ سے لباس کا انتخاب کیا، اسے پہننے کے بعد مجھے کرنسی کی تلاش ہوئی، جو کچھ مل سکا، میں نے حاصل کیا اور رات کی تاریکی میں شہریار ملّی کے مکان سے نکل آئی، مشہد چھوڑ دینا ضروری ہے، واپس تہران چلی جاؤں؟ میں نے سوچا، لیکن یہ حماقت ہے، خواہ مخواہ اپنے باپ کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ اور پھر اس بار مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ اسے سنبھال سکیں۔ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اونہہ...... تہران جانا ضروری نہیں ہے، لیکن مشہد چھوڑ دینا ضروری ہے۔

چھوٹا سا بریف کیس سنبھالے، میں ایک سنجیدہ لڑکی کی حیثیت سے آگے بڑھتی رہی، اِکّا دُکّا لوگ نظر آ رہے تھے، کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی اور میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی، مشہد کا ریلوے اسٹیشن بے حد خوبصورت ہے، جدید فن تعمیر کی حامل ایک کشادہ عمارت، جس کی چھت بغیر ستون کے ہے، پورا اسٹیشن سنسان پڑا تھا، بس عملے کے لوگ آرام کرتے نظر آ رہے تھے، میں نے ایک شخص کو روک کر ٹرین کے بارے میں پوچھا۔

''کہاں جانا ہے بانو؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''تہران جانے والی ٹرین کب آئے گی؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''اس وقت تو کوئی ٹرین نہیں ملے گی، صبح آتی ہے اور شام کو واپس چلی جاتی ہے۔''

''اب کوئی ٹرین آئے گی؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں تقریباً تین بجے آئے گی، لیکن وہ صرف نیشاپور تک جائے گی۔'' اس نے

بتایا اور میں نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھا۔ رات کے تین بجے تک میں یہاں انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ میں اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ مشہد سے نکل جانا ضروری ہے، لیکن کسی طرح چلتی رہی، راستوں سے مکمل طور پر واقف نہیں تھی، بس چل رہی تھی اور صرف ایک دُھن تھی، کسی طرح مشہد سے نکل جاؤں اور پھر شاید کسی ایسی ہی سڑک پر نکل آئی جو شہر سے باہر جاتی تھی، شہر کی روشنیاں اور آبادی کے نشانات پیچھے رہ گئے تھے، ابھی تک کوئی کار وغیرہ بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یوں بھی رات کے وقت سفر کم ہوتا ہے، لیکن بہت دور نہیں گئی تھی، زیادہ دیر تک سفر نہیں کیا تھا کہ تیز روشنی میں نہا گئی، روشنیاں بہت دُور تھیں لیکن اتنی طاقتور تھیں کہ مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر مشین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور آہستہ آہستہ ایران آئل کمپنی کا ایک دیوہیکل ٹینکر میرے نزدیک پہنچ گیا۔

بہت بڑا ٹینکر تھا، شاید دوسرے ملک تیل لے جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ڈرائیور نے رفتار سست کر دی اور پھر ٹینک رُک گیا۔ سامنے کا حصہ ہی کسی کمرے کی مانند تھا۔ دن رات کے سفر کی وجہ سے اسے بہت آرام دہ بنایا گیا تھا، تب ڈرائیور نے چیخ کر مجھے آواز دی۔

''اے محترمہ! کہاں جا رہی ہیں؟''

میں رُک گئی، میں سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کہہ کر مطمئن کروں، تب ڈرائیور نیچے اُتر آیا۔

''کیا تمہیں رات کا احساس نہیں ہے؟''

ادھیڑ عمر کا شریف صورت ایرانی تھا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر ایک ترکیب آ گئی اور میں خاموشی سے خالی خالی نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھنے لگی۔

''زیادہ وقت نہ دے سکوں گا، اگر میری مدد کی ضرورت ہے تو بتا دو۔'' بوڑھے ایرانی نے کسی قدر بیزار انداز میں کہا۔ وہ تنہا نہیں تھا، دو تین آدمی اس کے ساتھ اور تھے، سب کے سب نیچے اُتر آئے اور میرے گرد کھڑے ہو گئے۔

''گھر سے فرار ہو رہی ہے شاید۔'' ایک نے تبصرہ کیا۔

"اس ویران سڑک پر تنہا سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہی ہے، خوش بخت ہے کہ ابھی تک بُرے لوگوں سے نہیں ٹکرائی۔" بوڑھے نے کہا۔

میں ابھی تک خاموش تھی اور ویران ویران نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی، جو کچھ میں انہیں باور کرانا چاہتی تھی، ابھی تک ایک بھی احمق کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے، اگر تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو ہم چلے جائیں گے۔" بوڑھے نے کہا اور پھر دھمکی دینے کے انداز میں واپس مڑا۔ یہ لمحات میرے لیے صبر آزما تھے۔ بڑی مشکل سے موقع ملا تھا۔ ممکن ہے ان کے بعد اور کوئی نہ ملے، بمشکل تمام میں نے خود پر قابو پایا۔ چند لمحات اور سہی۔

اور پھر میری مسلسل خاموشی دیکھ کر ان میں سے ایک احمق کے ذہن کی برف پگھل ہی گئی۔

"کہیں یہ کوئی ذہنی مریضہ نہ ہو۔" اس نے تشویشناک انداز میں کہا۔

"سوتے میں چلنے کی عادی؟" دوسرے نے لقمہ دیا اور بوڑھے ڈرائیور نے چونک کر غور سے میری شکل دیکھی اور پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"ممکن ہے، اس کے چہرے سے ایسا ہی لگتا ہے، پھر تو ہم اس سے بیکار سوال کرتے رہے، چلو اسے لے چلو، یہاں سے نکل کر اس کے بارے میں سوچیں گے، دیر ہو رہی ہے، نہ تو واپس جا سکتے ہیں نہ اسے اس طرح اس ویران سڑک پر چھوڑ سکتے ہیں۔"

اور پھر مجھے دیوہیکل ٹینکر کے کمرے نما حصے میں پہنچا دیا گیا۔

کافی کشادہ اور آرام دہ جگہ تھی۔ فوم کی بنچیں بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر مجھے آرام کے لیے لٹا دیا گیا، میں خاموشی سے لیٹ گئی اور ان لوگوں کی گفتگو سننے لگی، میرے ہی بارے میں تبصرے کر رہے تھے، مجھے کسی اعلیٰ خاندان کی فرد سمجھا جا رہا تھا۔ سوچا جا رہا تھا کہ میری تلاش شروع ہو گئی ہو گی، وہ بے چارے خوف زدہ بھی تھے کہ کہیں ان کے سر کوئی الزام نہ لگ جائے، ویسے وہ تیل لے کر افغانستان جا رہے تھے، اور افغانستان کا نام سن کر میرے ذہن میں کچھ اور خیالات پیدا ہو گئے، کیوں نہ میں ان

کے ساتھ مل کر افغانستان پہنچ جاؤں۔ پھر وہاں سے پاکستان، پھر کہیں اور۔ ایڈونچر سے بھرپور زندگی۔ وہی زندگی جس کا تصور میرے ذہن میں ہے، لیکن ان لوگوں کو تیار کس طرح کیا جائے کون سی ترکیب کی جائے؟ میں سوچتی رہی اور میرے ذہن میں مختلف خیالات آتے رہے جو جو منصوبے میرے ذہن نے بنائے وہ بہت عمدہ تھے، مجھے احساس ہوا کہ میں عمدہ طریقے سے سوچ سکتی ہوں اور بالآخر میں نے چند منصوبے ذہن میں پختہ کر لیے، انہیں کے تحت میں ان لوگوں کو سنبھال سکتی تھی۔

آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی۔ بھاری ٹینکر کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ کبھی کبھی میری آنکھیں بند بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن سونا مناسب نہیں تھا۔ وہ لوگ مجھے یوسف آباد اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے، یوسف آباد ایران اور افغانستان کا سرحدی شہر تھا۔ وہاں سے مجھے بہ آسانی مشہد یا تہران بھیجا جا سکتا تھا اور یوسف آباد نہ جانے کس وقت آ جائے، مجھے اس سے قبل ہی اپنا ڈرامہ شروع کر دینا چاہیے تھا اور میں خود کو اس کے لیے تیار کر رہی تھی۔

اس وقت سب خاموش تھے، میں نے ان میں سے ایک ایک کا جائزہ لیا۔ ایک خوش رو اور قوی ہیکل جوان میں نے منتخب کر لیا اور پھر میں نے ایک زوردار چیخ ماری اور سب بُری طرح اُچھل پڑے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ سب مجھے گھورنے لگے تھے۔ ڈرائیور نے ٹریلر کی رفتار سست کر دی اور میں اُٹھ کر اپنے منتخب کردہ نوجوان سے لپٹ گئی۔

"بچا لو...... بچا لو خدا کے لیے مجھے ان بھیڑیوں سے بچا لو۔" میں اس بُری طرح اس نوجوان سے لپٹی تھی کہ وہ بدحواس ہو گیا۔ میں خوفزدہ نگاہوں سے بقیہ لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

بوڑھے شخص نے ٹینکر روک لیا تھا، پھر وہ میرے پاس آیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہم میں سے کوئی تمہارا دشمن نہیں ہے بیٹی، ہم سب تمہارے دوست ہیں، تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، یہاں سڑک پر تم تنہا جا رہی تھیں، ہم نے تمہیں اپنے ساتھ

بٹھا لیا۔''

''تم۔تم مجھے قتل تو نہیں کرو گے؟ تم......تم'' میں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

''بالکل نہیں، ہم تمہاری مدد کریں گے، تم جہاں جانا چاہو گی ہم تمہیں پہنچا دیں گے۔''

''اوہ۔'' میں نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہا۔ ''تو واقعی تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو؟''

''فخری! اسے گرم کافی پلاؤ۔'' بوڑھے نے ایک نوجوان کو مخاطب کیا اور نوجوان نے ایک بڑے تھرماس سے گرم کافی نکال کر مجھے دی۔ میں نے کافی قبول کر لی تھی۔ پھر میں معصوم بچوں کے سے انداز میں کافی کھو گئی، میں انہیں اچھی طرح متاثر کر لینا چاہتی تھی۔ کافی کا برتن خالی کر کے میں نے اسی نوجوان کی طرف بڑھا دیا، جسے میں نے منتخب کیا تھا اور جس کا نام ابھی مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

''تم اجازت دو تو ہم ٹینکر آگے بڑھائیں، راستے میں گفتگو کریں گے۔'' بوڑھے نے ملائمت سے کہا اور میں نے گردن ہلا دی، تب بوڑھے نے ٹینکر آگے بڑھا دیا۔

''تمہیں ہم پر اطمینان ہو گیا؟'' میرے ساتھی نے پوچھا اور میں نے ان سب کو ایک ایک نگاہ دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''اس سنسان سڑک پر تم کیسے نکل آئی تھیں؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔'' میں نے ایک سسکی سی لے کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''میں تو......مَیں تو اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔''

''اوہ۔ تو تم سوتے میں چلنے کی عادی ہو؟''

''میں نہیں جانتی۔'' میں نے اسی مظلومیت سے کہا۔

''مگر تم کس سے خوفزدہ ہو؟''

''وہ وہ جنہوں نے مجھے قید کر دیا تھا، وہ مجھے فروخت کرنا چاہتے تھے کئی جگہ

میری بات چل رہی تھی، وہ میری زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتے تھے۔ آہ! انہوں نے مجھے بڑی ذہنی اذیتیں دی ہیں۔ انہوں نے بڑی بے عزتی کی ہے میری۔ انہوں نے مجھے برہنہ کر کے دوسروں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ وہ میرے بدن کو دیکھیں اور میری زیادہ سے زیادہ قیمت دیں۔'' میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ اپنی آواز اور اپنے انداز پر مَیں خود بھی غور کر رہی تھی اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ بے شک اب تک میں نے خود کو نہیں آزمایا تھا، میں تو اس دنیا کے لیے بہت موزوں ہوں۔

میں نے ان سب کے چہروں پر بے پایاں ہمدردی دیکھی، وہ سب میری شکل دیکھ رہے تھے۔

''افسوس۔ یہ بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گئی۔'' بوڑھے نے کہا۔

''لیکن اس کی خوش بختی تھی کہ نکل بھاگی۔''

''لیکن یہ بریف کیس، کیا عالمِ بے ہوشی میں اس کا خیال بھی رہ جاتا ہے؟'' تیسرے ذہن نوجوان نے کہا اور میں نے چور نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بڑا ٹیڑھا سوال کیا تھا، تب بوڑھے نے جواب دیا۔

''ہاں۔ یہ ممکن ہے، اس انداز میں کہ اس کے ذہن میں پہلے سے فرار کا منصوبہ ہو اور یہ ہمت نہ کر سکی ہو، نیند کے عالم میں چلنے والے عموماً وہ کام ایسی حالت میں کر ڈالتے ہیں جو وہ ہوش و حواس میں نہیں کر سکتے۔''

''ویسے مقامی ہی لگتی ہے، پوچھا تو جائے، یوسف آباد میں ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے تاکہ وہ اسے اس کے گھر پہنچا دے۔''

''نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔ مجھے پولیس کے حوالے مت کرنا، میں یہیں اتر جاتی ہوں، میں خودکشی کر لوں گی، لیکن پولیس نہیں، ہرگز نہیں۔'' میں خوفزدہ انداز میں چیخ پڑی۔

''کیوں، تمہیں پولیس سے کیا خوف ہے؟''

''ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، ایک مرتبہ میں پولیس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن کچھ نہ

ہوا، مجھے واپس ان کے حوالے کر دیا گیا۔“

”اوہ۔ پھر کیا کیا جائے؟“

”صرف ایک ہی ترکیب ہو سکتی ہے۔“ اس نوجوان نے کہا جس کے نزدیک میں بیٹھی ہوئی تھی اور جواب بھی میرے بدن کا لمس محسوس کر کے سُرخ ہو رہا تھا۔

”کیا؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”اسے ساتھ لے چلیں، واپسی میں خود اسے وہاں تک پہنچا دیا جائے جہاں یہ رہتی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو افتخاری، یہ کیسے ممکن ہے؟“

”ممکن ہے۔“ میرے ساتھی نے کہا۔

”کس طرح؟“

”چھپا دیں گے اور اس وقت سرحد پر جبار مسعودی ہے، تم جانتے ہو میری شکل دیکھنے کے بعد تلاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر ہم کافی نیک نام بھی ہیں۔“

”اور افغان سرحد پر؟“ بوڑھے نے پوچھا۔

”تم یہ معاملہ میرے اوپر چھوڑ دو، ہم اسے ٹول بکس میں بند کر دیں گے میں ذمّہ داری لے لوں گا، اگر راز کھل گیا تو کہہ دوں گا میری محبوبہ ہے، سزا بھی مَیں ہی بُھگت لوں گا۔“ افتخاری نے کہا اور بوڑھا خاموش ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ افتخاری میرے بدن سے خارج ہونے والی شعاعوں کا شکار ہو گیا تھا۔

بہر حال میں اُمید و بیم میں ان کی شکل دیکھ رہی تھی کہ افتخاری نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم بالکل فکر مند نہ ہو، میں تم پر آنچ نہ آنے دوں گا، ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھیں گے اور افغانستان سے واپسی پر تمہیں وہاں پہنچا دیں گے، جہاں تم جانا پسند کرو گی۔“

”شکریہ!“ میں نے لرزتی، لیکن کسی حد تک پُرسکون آواز میں کہا۔

اور اس کے بعد عیش ہی عیش تھے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے دوست تھے اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ افتخاری سے میں نے خصوصی اگاؤ کا انداز

برقرار رکھا تھا جس سے وہ میری طرف کافی مائل نظر آ رہا تھا۔ میرے انداز میں مکمل معصومیت تھی جس کی وجہ سے وہ سب بھی میری طرف سے مطمئن تھے۔ بہر حال سفر جاری رہا۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی گئی۔ نیشا پور آیا اور پھر یوسف آباد۔ ایران و افغان سرحد کا یہ چھوٹا سا قصبہ خاصا غیر دلچسپ تھا۔ افتخاری کا کہنا درست رہا۔ ایران افغانستان سرحد پر ٹینکر روکا گیا لیکن افتخاری کی وجہ سے ٹرک کی تلاشی بھی نہیں ہوئی، بلکہ افتخاری کے دوست جبار مسعودی نے قہوہ بھی پلایا تھا جس کی ایک پیالی مجھے بھی دی گئی۔ افتخاری کی بات میں بڑی خاموشی سے مان رہی تھی۔ میں اسے پوری طرح شیشے میں اُتار لینا چاہتی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد افتخاری کو بھی احساس ہو گیا کہ میں اس کی طرف مائل ہوں۔

زندگی میں انتہائی بیش قیمت تجربات مجھے حاصل ہو چکے تھے اور آج میں یہ بات بڑے دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری عمر کی کسی ذہین لڑکی کو میرے سامنے لایا جائے، وہ مجھ سے زیادہ تجربے کار نہ ہو گی انسانی نفسیات کا جتنا گہرا مطالعہ میں نے کیا ہے کسی دوسری لڑکی نے نہ کیا ہو گا۔ مردوں اور خود عورتوں کے بارے میں جتنی معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں عام لوگوں کو نہ حاصل ہوئی ہوں گی۔ ایک حسین لڑکی نہایت آسانی سے ہر عمر کے مرد کی ہر قسم کی توجہ حاصل کر سکتی ہے۔ کسی بھی مرد کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں اس کے لیے بڑی حیثیت رکھتی ہے لیکن ایک اجنبی اور نوجوان لڑکی، اس کے لیے ان سب سے زیادہ پُرکشش ہوتی ہے، اس کا قرب، اسے ہر حالت میں پسند ہوتا ہے، ویسے مردوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض نیک اور شریف الطبع مرد اگر کسی عورت سے متاثر ہوتے ہیں تو بلاشک ان کے ذہن میں اس کا حُسن، اس کی جوانی ضرور ہوتی ہو گی۔ لیکن اب یہ لڑکی کی مرضی ہے، فوراً اسے بھائی بنا لو اور بہن کی حیثیت سے اس پر اتنی توجہ دو کہ اسے احساس نہ ہو سکے کہ کوئی ایثار کر کے اس نے غلطی کی ہے۔ بس مشکل نہ ہو گی۔ اس کے جذبات وہی رُخ اختیار کر لیں گے اور پھر زندگی کے کسی موڑ پر اگر اس کے جذبات کو کوئی دوسرا رنگ دینا مقصود ہو تو میں دعویٰ کرتی ہوں کہ یہ کام مشکل نہیں

ہو گا۔ البتہ کچھ بگڑے ہوئے مرد ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے نزدیک کوئی حسین اور اجنبی لڑکی صرف لڑکی ہوتی ہے اور وہ اسی حیثیت سے اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر وحشی صفت ہوں تو آگے قدم بھی بڑھا دیتے ہیں۔ بہرحال تم ان سے اجتناب کرتی رہو۔ خود ہی بور ہو جائیں گے اور تمہیں خود سے دور کر دیں گے، بہرحال یہ مختصر سی نفسیات ہے مردوں کی، لیکن میں طوالت نہیں اختیار کروں گی کیونکہ یہ میری کہانی میں حائل ہو گی۔

اس کے بعد مجھے تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ ٹول ٹیکس کافی بڑا تھا اور چونکہ انہوں نے خالی کر دیا تھا اس لیے میں بہ آسانی اس میں آ گئی لیکن تیل کی چکناہٹ اور بدبو کافی ناگوار ثابت ہوئی تھی۔ مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ لیکن گزر تو کرنا تھی۔ یہ کتنی عمدہ بات تھی کہ میں نے ایک بااثر شخص کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا اور ایران میں اب میرے لیے سزائے موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اس لیے زندگی بچانے کے لیے مشکلات سے تو گزرنا ہی ہو گا اور پھر میں تو مہمات کی شوقین بھی تھی۔

آئل ٹینکر کیونکہ ایران اور افغان سرحد پر اجنبی نہیں تھا۔ اس کے عملے کے لوگ بھی سرحدوں پر جانے پہچانے ہوں گے، بہرحال وہاں مختصر سی تلاشی ہوئی، تمام لوگ نیچے اُتر آئے۔ ٹول بکس کو ایران اور افغانستان کی سرحد کے درمیانی ٹکڑے میں کھلا رکھا گیا تھا تاکہ مجھے ہوا ملتی رہے لیکن افغان سرحد سے تھوڑی دور پہلے ٹینکر روک کر ٹول بکس میں تالا ڈال دیا گیا تھا۔ تالا ڈالنے سے قبل افتخاری نے مجھ سے کہا تھا۔

”یہاں تمہیں تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ میرا دل تمہارے لیے رو رہا ہے لیکن مجبوری ہے، تاہم میں کوشش کروں گا کہ یہ وقفہ طویل نہ ہو، کیا تم اس میں تھوڑا سا وقت بغیر ہوا کے گزار لو گی؟“

”ہاں۔ تم بےفکر رہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”تھوڑی بہت ہوا تمہیں ان درازوں سے ملتی رہے گی جو کافی چوڑی ہیں لیکن

بہرحال کھلی ہوا نہ ملے گی اور گھٹن کا احساس باقی رہے گا۔“

”تم فکر مت کرو افتخاری، میں نے شدید تکالیف میں زندگی بسر کی ہے۔ یہ تھوڑی سی تکلیف میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“ میں نے جواب دیا اور افتخاری نے میرا شانہ تھپتھپا دیا۔

ٹول بکس میں جو لمحات گزرے تھے ظاہر ہے میری زندگی میں پہلی بار آئے تھے، میں نے افتخاری سے کہا تھا کہ میں تکالیف کی عادی ہوں۔ بڑی مضحکہ خیز بات تھی، کیونکہ میں نے تو زندگی میں کسی تکلیف کا منہ بھی نہ دیکھا تھا۔ میری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں کے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ بے شمار لوگ مجھے آرام پہنچانے میں کوشاں رہتے تھے لیکن بہرحال ایک بات ضرور ہے، کبھی تکلیف نہ اُٹھانے کے باوجود میں تکالیف برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ چنانچہ ٹول بکس کا سفر میرے لیے کوئی حادثہ نہ بن سکا اور افتخاری کی دلی جدوجہد سے ہم نے بہ آسانی افغانستان کی سرحد بھی عبور کر لی۔ سرحد سے تھوڑی دور جاتے ہی ڈرائیونگ کرنے والے مہربان بوڑھے نے ٹینکر روک لیا، سب ہی اُتر کر میری طرف لپکے تھے اور جب میں ٹول بکس سے صحیح و سلامت نکل آئی تو انہوں نے سکون کے گہرے سانس لیے۔

”بلاشبہ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔“ وہ میری تعریف کرتے ہوئے بولے، افتخاری خاص طور سے میرے اوپر نثار ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دونوں شانوں سے سہارا دیا ہوا تھا، پھر میں دوبارہ ٹینکر پر آ بیٹھی اور ٹینکر چل پڑا۔

میں نے یہ مختصر سفر تو بہ آسانی کر لیا، لیکن میرا لباس بہت خراب ہو گیا اور میرے بدن پر جگہ جگہ تیل کے دھبے پڑ گئے ہیں ان کا کیا کروں؟“ میں نے راستے میں افتخاری سے کہا۔

”اوہ۔ تھوڑی دیر انہیں برداشت کر لو، بہت جلد ہم ہرات پہنچ جائیں گے۔ ہرات میں...... ہرات میں.....“ افتخاری کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیا خیال آیا تھا، پھر اس نے دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آقائے شایان! اگر آپ اجازت دیں تو میں ان خاتون کے ساتھ ہرات میں اُتر جاؤں، انہیں آرام کی ضرورت ہے اور ہرات میں میرا ایک افغانی دوست بھی رہتا ہے، آپ جب کابل سے واپس آئیں تو مجھے یہاں سے ساتھ لے لیں، اس وقت تک میں ان کے لیے مناسب بندوبست بھی کرلوں گا۔ عام حالات میں ہم انہیں کہاں کہاں لیے پھریں گے۔''

''اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو کیا حرج ہے؟'' بوڑھے نے کہا۔

''خاتون۔ آپ کو اعتراض ہے؟'' افتخاری نے مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''بس تو ٹھیک ہے، تم ہرات میں اُتر جانا۔'' بوڑھے آقائے شایان نے جواب دیا۔ دوسرے لوگوں کے چہروں کے تاثرات تو میں نوٹ نہیں کرسکی تھی۔ لیکن افتخاری کا چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔

پھر ٹینکر ہرات پہنچ گیا اور ایک مخصوص جگہ افتخاری نے اسے رُکوا دیا۔ پھر اس نے سہارا دے کر مجھے اتارا اور دوسرے لوگ معنی خیز انداز میں مسکرائے گویا افتخاری کو مبارکباد دیتے واپس چلے گئے، افتخاری کمال محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر چل پڑا۔ اس نے میرا بریف تھاما ہوا تھا۔

''آپ کو میری وجہ سے تکالیف اُٹھانا پڑ رہی ہے افتخاری۔'' راستے میں میں نے کہا۔

''یہ تکلیف تو میرے لیے عین سعادت ہے بانو، کاش میں آپ کو سکون پہنچا سکوں۔''

''آپ بے حد نیک نفس انسان ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو یقین ہے؟'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''یقین نہ ہوتا تو میں اس قدر مطمئن کیوں ہوتی۔'' میں نے جواب دیا۔ میں کتابوں سے بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ میرے تجربات میری عمر سے کہیں آگے تھے اور میں انسانی نفسیات کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی، چنانچہ اس سیدھے سادے شخص کے لیے مناسب الفاظ تراشنا اور انہیں مناسب لہجے میں ادا کردینا کافی تھا، وہ بہ آسانی مطیع ہوگیا تھا۔

''لیکن اس کے باوجود میں بانو کے نام سے ناواقف ہوں۔'' افتخاری نے کہا۔

''مصائب کے شکار لوگ بعض اوقات خود بھی اپنا نام بھول جاتے ہیں، میری اپنی اہمیت میری نگاہوں میں اس قدر گر چکی ہے کہ میں نے اپنا نام بتانے پر غور ہی نہیں کیا۔''

''زندگی گوناگوں واقعات سے عبارت ہوتی ہے بانو، دنیا میں آنے کے بعد انسان کو نت نئے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، بس حوصلہ ضروری ہے، جو بات ہمیں تکلیف دیتی ہے ہم اسے مصائب کا نام دے دیتے ہیں۔ اور جو ہمیں سکون بخشتی ہے ہم اسے راحت کہتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کے دونوں رُخ لازمی ہیں۔ چنانچہ جو رُخ جب تک برقرار رہے اسے برداشت کرنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔ زندگی کے یہ دونوں رُخ دائمی نہیں ہوتے۔'' افتخاری نے سمجھانے والے انداز میں کہا اور میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

''اب بھی اپنا نام نہیں بتائیں گی؟''

''ڈلرومیہ ہے میرا نام، نہ جانے والدین نے یہ نام کیوں رکھ دیا تھا؟''

''والدین حیات ہیں؟''

''جب مَیں ان سے جدا ہوئی تھی تو حیات تھے، میری جدائی پر کیا بیتی معلوم نہیں۔''

''اوہ۔ فکر نہ کریں۔ واپس چل کر ہم انہیں تلاش کریں گے۔'' افتخاری نے کہا۔

ہرات کی گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے، ہم ایک رہائشی علاقے میں پہنچ گئے اور پھر ایک درمیانہ قسم کے مکان کے سامنے رُک گئے۔ مکان پر دستک دینے پر ایک لڑکا باہر نکلا جس سے افتخاری نے کسی چنگیزی کے بارے میں پوچھا اور جب یہ پتہ چل گیا کہ چنگیزی موجود ہے تو اس نے کہا چنگیزی سے کہہ دیا جائے کہ اس کا دوست افتخاری آیا ہے۔

پٹھانوں کی روایتی مہمان نوازی کا خوب لطف آیا۔ چنگیزی روایتی پٹھان تھا۔ اتنی آؤ بھگت کی اس نے ہماری کہ بس۔ ہم دونوں کو علیحدہ رہائش گاہ دے دی گئی۔ افتخاری نے مجھے اپنی بیوی بتایا تھا، جس کے لیے تنہائی میں اس نے بے حد معذرت کی۔

''چنگیزی میرا بے تکلف دوست ہے، لیکن اس کے باوجود میں تھوڑی سی

رازداری ضرور چاہتا تھا، تم میرے الفاظ کا بُرا نہ ماننا۔"

"نہیں افتخاری! حالات نے مجھے اس قدر کچلا ہے کہ اب ان باتوں پر تو میں نے توجہ دینا ہی چھوڑ دی ہے۔ تم نے ٹھیک کیا، اس طرح ہمیں اس کا خلوص مل گیا ہے ورنہ ممکن ہے صورت حال بدل جاتی۔"

"یہی بات ہے، بہرحال میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں ہے، ویسے ہمیں کتنے دن قیام کرنا ہوگا؟"

"ایک ہفتے سے زیادہ لگ جائے گا ان لوگوں کی واپسی میں، وہ کابل جائیں گے، تیل خالی کریں گے اور پھر یہاں واپس آئیں گے، لیکن تم فکر مت کرو، ہرات میں ہمارے شب و روز بہت اچھے گزریں گے، میں تمہیں یہاں کی سیر کراؤں گا۔"

"مجھے اب کسی بات کی فکر نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر رات کو افتخاری کو میرے کمرے میں ہی سونا پڑا۔ میں ساری رات جاگتی رہی تھی اور میرا ذہن گوناگوں خیالات کا حامل رہا تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ کافی دلچسپ تھا یہ شخص خوب مل گیا تھا۔ پہلی رات کو اس نے انتہائی شرافت کا ثبوت دیا تھا اور اطمینان سے سوتا رہا جب کہ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اپنی شرافت کی قیمت وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن بے وقوف اطمینان سے سوتا رہا تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ میں ایران سے نکل چکی تھی، لیکن ایران اور افغانستان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا قانون کے ہاتھ کافی لمبے ہوتے ہیں، یہاں سے بھی جلد ہی نکل جانا بہتر ہوگا۔ اس شخص کے لیے کیا کیا جائے جو میرا ہمدرد ہے۔ رات کے آخری پہر میں مَیں نے سوچا کہ اتنی جلد بازی بھی مناسب نہیں ہے۔ شریف النفس افتخاری کے ساتھ چند روز یہاں گزار کر افغانستان کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور پھر یہاں سے آگے بڑھا جائے، رہی اس کی بات تو بظاہر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، خاصہ برخوردار قسم کا آدمی تھا۔

چنانچہ میں سوگئی اور پھر خوب دن چڑھے اُٹھی۔ میاں افتخار محبت میں ایثار کی

سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ میری وجہ سے انہوں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تھا۔ جب کہ ان کا دوست چنگیزی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کام پر جا چکا تھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے ناشتہ کیا پھر افتخاری نے پیش کش کی کہ بازار چلا جائے اور کچھ خریداری کی جائے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا، اس لیے میں تیار ہوگئی اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میرے بریف کیس میں کافی کرنسی موجود تھی جسے یہاں تبدیل کرایا جا سکتا تھا۔ لیکن میں نے ضروری نہیں سمجھا، جب تک اسے محفوظ رکھا جائے ٹھیک ہے اور پھر افتخاری یہ بات کہاں پسند کرتا کہ اس کی موجودگی میں مَیں خرچ کروں؟

پورا دن سیر و تفریح اور خریداری میں گزرا، نہ جانے افتخاری کی مالی حیثیت کیا تھی۔ ممکن ہے جس قدر وہ خرچ کر رہا تھا، اتنی حیثیت نہ رکھتا ہو کیونکہ خوبصورت عورت کے سامنے تو اچھے اچھے اپنی حیثیت بھول جاتے ہیں۔

ہرات ایک خوبصورت شہر ہے، تاریخ کا گہوارہ۔ سرسبز درختوں سے گِھرا ہوا شہر، مختلف قسم کے درختوں اور پھلوں کے باغات سے مالا مال درختوں کے اس علاقے کو ایرانی مصوروں نے موتیوں کی مالا کہا ہے اور ہرات کو ان کے درمیان ایک یاقوت کی حیثیت دی ہے۔ درختوں سے پرے مٹی کی دبیز دیواروں کے پیچھے سرو کے درختوں میں چھپے ہوئے رہائشی مکانات فٹ پاتھوں پر لگی ہوئی دکانیں، قہوہ خانوں میں الاپے جانے والے خراسانی لوک گیت۔ تیموری، سلطان حسین مرزا کے دربار کا بہزاد، جس کی تصاویر میں زندگی رقصاں ہے۔ درحقیقت وہ کہاوت حقیقت بن جاتی تھی کہ خراسان ایک صدف ہے اور ہرات اس میں چمکتا ہوا موتی۔

قدیم زمانے مین اس علاقے کو آریا یا آریانہ کہا جاتا تھا یعنی آریاؤں کا مسکن جو بعد میں بگڑ کر ہری ہوگیا اور پھر ہرات کے نام سے مشہور ہوگیا۔ دریائے ہری اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ ۴۵ ہجری میں ہرات حضرت عثمان کے گورنر عبداللہ بن امیر کے ہاتھوں فتح ہوا اور ایران کی مسلم سلطنت کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔ ان دنوں یہاں کی آبادی زرتشت کی پیروکار تھی۔ غزنوی سلطانوں اور سلجوق ترکوں کے بعد

خوارزم کے سلطانوں کے زیرنگیں آ گیا اور پھر اسے ایک اہم تجارتی مرکز قرار دیا گیا۔
ہرات درجنوں بار اُجڑا درجنوں بار بسا۔ غرض اس کی طویل تاریخ تھی اور میں اس کی
سیر کرتے ہوئے اس کی تاریخ میں کھوگئی۔

ملکہ گوہرشاد نے اسے خوبصورت اور عالیشان محلات سے سجا دیا اور آج بھی
ایک لق و دق صحرا میں اس حسین ملکہ کے مقبرے کے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں۔
میں سارا دن ہرات کی تاریخ میں کھوئی رہی اور سب کچھ بھول گئی۔ افتخاری ایک متحمل
مزاج انسان تھا۔ مجھ سے اس بُری طرح متاثر ہوا تھا کہ خود کو بھول گیا تھا۔

پھر جب رات ہوگئی تو ہم واپس چنگیزی کے مکان پر پہنچ گئے جہاں اس نے ہم
دونوں کا استقبال مسکراتے ہوئے کیا۔ افتخاری نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی پہلی بار
ایران سے افغانستان آئی ہے اس لیے اسے ہرات کی سیر کرا رہا تھا۔

''افسوس، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ میری مصروفیات مجھے اس کی
اجازت نہیں دیتیں۔''

''ٹھیک ہے چنگیزی! یوں بھی ہم میاں بیوی کے درمیان کہاں آ ؤ گے؟''
افتخاری نے بھی مسکراتے ہوئے کہا اور چنگیزی قہقہے لگانے لگا۔

افتخاری چہرے سے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ میں اسے
پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور یہ بات اس کے لیے بہت دل خوش کن تھی۔ لیکن
دوسری رات بھی اس نے حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی سکون سے سو گیا۔ نہ
جانے کیوں مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ اس طرح نظر انداز کر کے سو جاتا ہے کمینہ کہیں کا
جیسے میری نسوانیت کا کوئی وجود ہی نہ ہو اس کی نگاہ میں۔ جیسے میرے حسن نے اس کے
ذہن میں کوئی تحریک ہی نہ پیدا کی ہو۔

پھر میں نے سوچا بہتر یہی ہے اگر وہ ایسی حرکت کرنے کی کوشش بھی کرتا تو
میں اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی، اس کے ساتھ چند سکون کے سانس لینے کا موقع
مل گیا تھا ورنہ اس کے بعد پھر تنہا جدوجہد ہو جائے گی۔ اس جدوجہد کی ابتدا سے
قبل اگر تھوڑا سا آرام کر لیا جائے تو کیا حرج ہے، دوسرا دن بھی مصروفیات میں

گزرا، آج میں نے بہت سی معلومات بھی حاصل کی تھیں اور اپنے طور پر چند
ضروری چیزوں کی خریداری بھی۔ حالانکہ ابھی میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام
نہیں تھا لیکن خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے میں نے بہت سی باتیں سوچی تھیں اور
ان پر عمل بھی کرسکتی تھی۔

لیکن وہ ہو گیا جو میرے ذہن میں نہیں تھا۔ تیسری رات افتخاری پٹڑی سے اُتر
گیا۔ گوہرشاد کے مقبرے میں وہ کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں
پوچھیں جو اس کے قدم آگے بڑھانے کی نشاندہی کرتی تھیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا بردہ
فروشوں کے درمیان رہ کر میں اپنی عصمت محفوظ رکھ سکی ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ
چونکہ وہ مجھے اچھی قیمت پر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے میری
حفاظت کی۔ افتخاری یہ سن کر بہت خوش ہوا اور پھر اس نے بڑے رومانی انداز میں میرا
ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم اب اپنی آئندہ زندگی کے لیے پریشان نہ ہو دلروزیہ! میں تمہیں تمہارے
والدین کے پاس لے جاؤں گا، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا، یہاں تک کہ اگر تم
نے مجھے قبول کر لیا تو میں زندگی بھر کے لیے تمہارا غلام بن جاؤں گا۔ نہ جانے کیوں
ان الفاظ پر وہ میری نگاہوں سے گر گیا۔ غلام بن جاؤں گا۔ غلام...... میرا
منہ اس طرح بن گیا جیسے کوئی کڑوی چیز کھا لی ہو، فضول انسان، خوشامدی...... عام
مردوں کی مانند۔''

شام تک میرا موڈ بگڑا رہا، میں نے اس سے زیادہ باتیں بھی نہیں کی تھیں اور
عام دنوں کی بہ نسبت آج میں جلد ہی سونے لیٹ گئی اور شاید سوبھی گئی۔ ہاں یہ اندازہ
نہیں لگا سکی تھی کہ کتنی دیر سوئی، کوئی خاص ہی وجہ تھی جس سے آنکھ کھلی۔ میں غور کرنے
لگی۔ کمرے میں حسبِ معمول نیلی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں
میرے چہرے پر ایک سایہ پڑ رہا تھا اور یہ سایہ افتخاری کا تھا وہ میرے بالکل نزدیک
بیٹھا تھا اور اس کے تیز سانسوں کی آواز مجھے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ بدن پر ایک
عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی جاگا کہ میرے بدن

سے شب خوابی کا لبادہ ہٹا ہوا ہے اور بدن نیم عریاں ہے۔ ایک لمحے کے لیے ذہن ایک ٹٹھے احساس میں کھو گیا۔

اب کیا ہو گا۔

انتظار اور میں نے انتظار میں دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ تب چند ساعت کے بعد افتخاری کا کھردرا ہاتھ میرے بدن پر آ پڑا۔ وہ ہاتھ بُری طرح لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ شاید افتخاری کا پورا بدن کانپ رہا تھا کیونکہ بستر ہل رہا تھا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ افتخاری کا ہاتھ ایک جگہ رک گیا، وہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا اُس کا ہاتھ میرے شانے پر رکھا تھا اور یہاں اس کے ہاتھ کا لمس پورے بدن میں عجیب سی گدگدی پیدا کر رہا تھا۔ میں تحریک کا انتظار کرتی رہی لیکن یوں لگتا تھا جیسے افتخاری کے بدن کی جان ہی نکل گئی ہو، جیسے میرے سامنے وہ مردہ حالت میں بیٹھا ہو اور نہ جانے کیوں نفرت کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے شعلہ بار آنکھیں کھول دیں اور افتخاری کو بھی احساس ہو گیا کہ میں جاگ اُٹھی ہوں۔ اس کی گھگی بندھ گئی وہ اور زور سے کانپنے لگا اور پھر اس کی عجیب سی آواز اُبھری۔

''مَیں...... مَیں معافی چاہتا ہو دلروزیہ! میں...... میں بہک گیا تھا، میں جذبات پر قابو نہیں پا سکا تھا، تم ناراض ہونا، میں دراصل، مَیں...... مَیں......'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں اس کی شکل دیکھ رہی تھی، جانے میرے ذہن میں کیسے خیالات آ رہے تھے، نہ جانے کیسا احساس ہو رہا تھا لیکن ایک احساس ان سب میں نمایاں تھا اور وہ تھا اس شخص کے وجود سے نفرت کا احساس، جس نے سوتے میں میرے بدن کو عریاں کر دیا تھا اور اب میرے نزدیک بیٹھا کانپ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں، مجھے اس سے نفرت کا احساس کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ جب وہ میرے نزدیک بیٹھا تھا جب مجھے اپنے بدن کی عریانی اور اس کی قربت اور اس کے لمس کا احساس ہوا تھا تو مجھے بُرا نہیں لگا تھا، لیکن اب...... اب مجھے اس سے گھن آ رہی تھی۔

میں سوچ رہی تھی کہ وہ اپنی ہمدردی کا معاوضہ چاہتا ہے، وہ میری تنہائی سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔

''دلروزیہ!'' اس نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے؟'' مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا دلروزیہ؟''

''کیوں پوچھ رہے ہو یہ بات، تم اپنی ہمدردی کی قیمت وصول کرنے آئے تھے نا۔ میں تنہا بھی ہوں اور تمہارے دوست کو بھی معلوم ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ ان دونوں باتوں سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے افتخاری۔ تم نے میرے بدن کو عریاں کر دیا ہے، اب...... اب آگے قدم کیوں نہیں بڑھاتے؟'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ بات نہیں ہے دلروزیہ! یہ بات نہیں ہے، بس تم مجھے معاف کر دو خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' وہ بُری طرح گڑگڑانے لگا، لیکن میرا دل نہ پسیجا نہ جانے کیوں مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس نفرت کا اظہار مناسب نہیں ہے، میں نے سوچا۔ ابھی تو مجھے اس شخص سے کئی کام لینے ہیں اور پھر کام نہ بھی لئے جائیں تب بھی، میں اس سے کیا کہہ سکتی ہوں۔

''کیا میں اُمید رکھوں دلروزیہ کہ تم مجھے معاف کر دو گی؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''ٹھیک ہے افتخاری، تم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ہے، میں تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔''

''میں تمہیں پوری زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں دلروزیہ، یقین کرو اگر میں نے یہ جسارت بھی کی ہے تو میں اسے نبھا دوں گا، جو کچھ میں کر چکا ہوں اس پر سخت شرمندہ ہوں اور آئندہ اس کا ازالہ کرنے کی کوشش شروں گا۔'' وہ اُٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور اس کے بعد وہ رات بھر واپس نہیں آیا۔ میں اس وقت عجیب کش مکش کا شکار تھی۔ ذہنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ کئی دن گذر گئے اور اب مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ کیا میں یہاں وقت نہیں برباد کر رہی ہوں کیا میں اتنی ہی بے بس، اتنی ہی احمق ہوں کہ اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتی میں ایران سے نکل آئی ہوں۔ خطرہ کافی حد تک ٹل گیا ہے پھر میں کیوں اس گدھے کے ساتھ مقیم ہوں۔

اور پھر اس گدھے کے لیے بھی میں نے کچھ سوچ لیا، اور جو کچھ میں نے سوچا تھا اس کے بعد میں نے حیرت انگیز طور پر خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ اتنا پرسکون کہ میں گہری

نیند سوگئی۔ دوسری صبح جاگی تو ذہن کی کیفیت بے حد خوشگوار تھی۔ افتخاری شرمندہ سا چہرہ لیے میرے سامنے آیا تھا، اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

''دلروزیہ!'' اس نے اداس لہجے میں مجھے پکارا، اس نے مجھ سے نگاہیں نہیں ملائی تھیں۔

''ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا لیکن میرے دل میں اس کے لیے شدید کدورت تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ میرا لہجہ کافی شگفتہ تھا۔

''ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں دلروزیہ۔ رات کو میں نے جو حرکت کی ہے اس کے لیے میں تمہارا مجرم ہوں لیکن میرا دوست چنگیزی میری عزت کرتا ہے تم ظرف سے کام لیتے ہوئے اتنا احسان کر دو کہ اس کے سامنے ظاہر نہ ہونے پائے تم اس کے سامنے مجھ سے ناراض مت رہنا ورنہ وہ اس بارے میں ضرور پوچھنے کی کوشش کرے گا۔

''ارے کیسی باتیں کر رہے ہو افتخاری! کیا میں یہ بات بھول سکتی ہوں کہ تم میرے محسن بھی ہو۔ تم صرف میرے لیے ہرات میں قیام پذیر ہو۔ تم نے وقت سے پہلے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی جو بہر حال بہتر نہ تھا۔ لیکن اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میں تم سے اس قدر ناراض ہو جاؤں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور افتخاری چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سُرخی دوڑ گئی۔

''تم طنز تو نہیں کر رہیں دلروزیہ؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''محسنوں پر طنز نہیں کیا جاتا افتخاری۔' میں نے پُرتاثر لہجے میں کہا۔

''اب تو تم نے بھی میرے اُوپر احسان کر دیا ہے دلروزیہ۔ تم نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے میرے اتنے بڑے جُرم کو معاف کر دیا ہے میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں۔'' اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور میں مسکرا دی۔

حسبِ معمول ناشتہ کیا۔ پھر چنگیزی تو ہمیں چھوڑ کر اپنے کام پر چلا گیا اور ہم دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

''آج کیا پروگرام ہے افتخاری؟''

''جو حکم سرکار کا'' افتخاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ملکہ گوہر شاد کے کھنڈرات بے حد دلکش ہیں۔ وہاں جا کر ذہن پر ایک عجیب سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مجھے وہ جگہ بے حد پسند آئی ہے آج بھی وہیں چلیں گے۔ بڑی پُرسکون جگہ ہے۔''

''ضرور چلیں گے۔'' افتخاری نے قربان ہونے والے انداز میں کہا اور میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ لیکن دل ہی دل میں، مَیں مسکرا رہی تھی۔ اگر یہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر ہوتی تو لوگ اس سے خوفزدہ ہو جاتے۔

گھر سے چلتے وقت میں نے وہ بڑا پرس ساتھ لے لیا جو افتخاری نے میرے لیے خریدا تھا۔ بریف کیس کا بیشتر سامان اس پرس میں موجود تھا۔ بس ایسی چیزیں بریف کیس میں چھوڑ دی گئی تھیں جن کی مجھے نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی وہ کوئی حیثیت رکھتی تھیں۔ پرس کافی وزنی ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے افتخاری کو اس کا احساس نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

قدیم طرز کے تنگ بازاروں سے گزرتے ہوئے ہم مسجد جامی کے پاس پہنچے اور وہاں سے شاہ رُخ کی حسین ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کی طرف چل دیئے۔ جن کا اب شہر سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ایک لق و دق صحرا میں بکھرے ہوئے یہ کھنڈرات واقعی انوکھے ہیں۔ مقبرے کے شکستہ گنبد کی نیلی اینٹیں خراسان کی تپتی دوپہر میں چمکتی ہیں تو ویرانے میں نیلگوں لہریں اُبھرنے لگتی ہیں۔ باہر دھوپ سخت تھی لیکن مقبرے کے کچھ حصے اب بھی سائبان رکھتے ہیں اور ان کے نیچے کی ٹھنڈک بے حد سکون بخش تھی۔ یہاں آ کر ہمیں بڑا سکون محسوس ہوا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ مقامی لوگ تو اس دوپہر میں یہاں آنے کا تصور بھی نہیں کرتے۔ رہ گئے سیاح تو بعض سرپھرے آ بھی جاتے ہوں گے ورنہ عموماً شام ہی کے وقت سیاح یہاں آتے جاتے ہوں گے۔ دن کی تفریحات کے لیے ہرات میں دوسری جگہیں بھی ہیں۔

''واقعی یہاں بے حد سکُون ہے۔'' افتخاری نے کہا۔

''تم تو پہلے بھی یہاں آئے ہو گے۔ میرا مطلب ہے کل سے پہلے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ اکثر آتا رہتا ہوں۔ یہاں کے لیے بھی تیل لانا پڑتا ہے۔ ویسے عموماً کابل اور قندھار ہی جانا ہوتا ہے۔'' افتخاری نے جواب دیا۔

''اس جگہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا اور افتخاری نے ایک گہری سانس لی پھر بولا۔

''بعض اوقات تم یقین کرو دلروز یہ، ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں، لیکن کوئی خاص تاثر قبول نہیں کرتے۔ ہاں اگر کوئی ایسا شخص اسے پسند کرنے لگے، جو ہماری روح سے تعلق رکھتا ہو تو پھر وہ جگہ خود بخود حسین لگنے لگتی ہے۔ میں پہلے بھی ایک بار یہاں آ چکا ہوں لیکن کوئی خاص بات محسوس نہیں کی لیکن آج کی بات اور ہے آج مجھے ان کھنڈرات میں بے حد دلکشی محسوس ہو رہی ہے۔''

''اوہ۔ میری بھی یہی کیفیت ہے افتخاری۔ میں سوچ رہی ہوں کاش میں گوہر شاد ہوتی اور ہمیشہ کے لیے ان پرسکون کھنڈرات میں سو جاتی۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''تم بہت زیادہ متاثر ہوگئی ہو دلروز یہ!''

''تم نہیں ہوا افتخاری؟'' اس نے آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

''بلاشبہ یہ متاثر کن جگہ ہے۔ لیکن......!''

''کیا تمہارے دل میں یہ خواہشیں بیدار نہیں ہوتی کہ تم ہمیشہ کے لیے ان کھنڈرات میں سو جاؤ۔'' میں نے پوچھا۔ نہ جانے میرے اندر سے کون سی قوت اُبھر رہی تھی۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے خیالات آ رہے تھے۔ میری ذہنی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب سا احساس جاگ رہا تھا۔

''بے شک میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے لیکن......'' افتخاری نے کہا۔

''لیکن کیا افتخاری؟'' میں نے اسی طرح آنکھیں بند کیے پوچھا۔ میرے دماغ میں سُرخ لہریئے گردش کر رہے تھے۔ خون کی چھینٹیں اُڑ رہی تھیں۔ افتخاری جو رات کو میرے قدموں میں گڑگڑا رہا تھا، اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور پھر نہ جانے افتخاری کی شکل کس طرح ہارون ملّی کی طرح ہوگئی۔ وہ مجھے کچھ سمجھا رہا تھا، کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اس کے سر سے خون اُبلنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے سسکاریاں

سی نکلنے لگیں۔

''لیکن ہم جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ابھی ہمیں زندگی کے بہت سے راستے طے کرنے ہیں۔''

''لیکن خواہش، خواہش ہوتی ہے افتخاری۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔''

''کیا تم میری یہ خواہش پوری کر سکتے ہو؟''

''ایں...... انوکھی خواہش ہے لیکن اگر تمہیں یہ جگہ پسند ہے تو ہم جب تک یہاں ہیں روز آئیں گے اور اس کے بعد بھی اگر تم......''

''تمہاری بھی تو یہی خواہش ہے افتخاری۔''

''لیکن میں اس خواہش کو کیسے پورا کر سکتا ہوں۔''

''میں کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کر سکتی ہوں۔''

''کس طرح دلروز یہ؟'' افتخاری اب پریشان ہو گیا تھا۔

''آنکھیں بند کرو، آنکھیں بند کرو۔'' میں نے اپنا پرس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا اور افتخاری نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ میری ضد پر مسکرا دیا تھا لیکن اُسے میری نیت کا علم نہیں تھا۔ اسے آنے والے لمحات کا کوئی احساس نہیں تھا۔ نوکدار اوزار پرس سے باہر نکل آیا جس کی وجہ سے پرس وزنی ہو رہا تھا۔ یہ اوزار میں نے چنگیزی کے ہاں سے حاصل کیا تھا۔ افتخاری کی آنکھیں بند تھیں۔ دوسرے لمحے میرے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور نوکدار ہتھیار پوری قوت سے افتخاری کے سر کی ہڈی میں اُتر گیا۔

ایک خوفناک چنگھاڑ گونجی تھی۔ میں اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ افتخاری کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ چہرے پر تحیر کے آثار منجمد تھے اور پھر اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

میں نے خود کو خون کے چھینٹوں سے بچائے رکھا تھا تاکہ یہ میرے لباس کو خراب نہ کر دیں۔ اس کے بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور برق رفتاری سے واپس چل پڑی۔ دل میں ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ ایک انوکھا سرور رگ و

پے میں دوڑ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ راستے میں جو بھی نظر آئے اسے قتل کر دوں۔ ہر مرد کے ہاتھ میرے بدن پر رینگ رہے تھے اور جب میں اس کی جانب دیکھتی وہ کانپ اُٹھتا، لرزنے لگتا۔ بڑی مشکل سے اپنی کیفیت سنبھالی۔ ذہن میں احتیاط جاگ اُٹھی تھی۔

جو کچھ کر چکی ہوں اس کا حساب کتاب بھی ہے۔ افتخاری کا قتل زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہے گا۔ اس سے قبل ہی یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔ طویل سفر طے کر کے میں اس راستے پر پہنچ گئی جو ہرات سے باہر جاتا ہے۔ باقاعدہ سواری کے بارے میں تو معلومات بھی نہیں تھیں اور پھر اس میں وقت ضائع کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کسی سے لفٹ مل جائے تو بہتر ہے۔

اور تقدیر ساتھ دے رہی تھی۔ بہت دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سفید رنگ کی ایک خوبصورت کار نظر آئی تھی۔ میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اُسے اشارہ کرنے لگی۔ اگر کوئی نوجوان منچلا ہوا تو لطف ہی آ جائے۔ لفٹ بھی فوراً ہی مل جائے گی اور......لیکن اس 'اور' سے آگے خود میرا ذہن تاریک تھا۔ نہ جانے میں کیا چاہتی تھی۔

کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔ اگلی سیٹ پر ایک باوقار سا نوجوان اور ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، میں نے گہری سانس لی۔

''کہاں جائیں گی آپ؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''جہاں تک آپ چھوڑ دیں۔'' میں نے جواب دیا۔ نوجوان نے یہ الفاظ انگریزی میں ادا کئے تھے لیکن اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایرانی ہے۔ لڑکی بھی ایرانی معلوم ہوتی تھی۔

''ہم قندھار جا رہے ہیں لیکن تھوڑی دیر گرشک میں قیام کریں گے۔ آپ جہاں کہیں؟''

''اوہ۔ اتفاق ہے۔ میں بھی قندھار ہی جانا چاہتی ہوں۔''

''بس تو آیئے۔ سفر دلچسپ رہے گا۔ یوں بھی طویل ہے۔'' نوجوان نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور میں اندر بیٹھ گئی۔ کار آگے بڑھ گئی۔ ایک لمحے میں، میں نے کچھ

فیصلے کئے تھے اور مطمئن ہوگئی تھی۔

''آپ افغان ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں میں بریٹن ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ بہرحال میں انگریزی زبان پر قادر تھی۔

''اوہ، حیرت ہے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آپ یا تو ایرانی ہوسکتی ہیں یا افغانی۔'' نوجوان نے کہا۔

''بدقسمتی سے میں نے ابھی تک ایران نہیں دیکھا۔ ہاں یہاں سے ایران جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔''

''سیاح ہیں؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ دونوں کافی خوش اخلاق تھے۔ ایرانی تھے اور یہاں ایرانی قونصلیٹ میں کام کرتے تھے۔ دونوں نے صرف آٹھ ماہ قبل شادی کی تھی۔ لڑکی ضرورت سے زیادہ باتونی تھی۔ تین سال سے ایرانی قونصلیٹ آف قندھار میں کام کر رہی تھی اور افغانستان سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کے علاوہ سیاحت اور تاریخ سے کافی دلچسپی رکھتی تھی۔

گرشک پہنچ کر نوجوان نے کار ایک موزوں جگہ پر روک دی اور اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''رزمہ! اگر تم اجازت دو تو میں اپنا کام کر آؤں۔ تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جائے گا۔ اس دوران تم خاتون کو سیر کرا دو۔ ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد اسی جگہ آ جانا۔''

''اوہ ضرور ڈارلنگ! اس طرح تمہاری کاروباری باتوں سے بور ہونے سے بھی بچ جاؤں گی۔'' لڑکی نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور نوجوان چلا گیا۔ تب اسٹیئرنگ اس کی بیوی نے سنبھال لیا اور کار آگے بڑھا دی۔ میں بھی اس پروگرام سے خوش تھی۔ میری کیا پوزیشن تھی، کیا کر کے آئی تھی، اس وقت سب کچھ بھول گئی تھی۔ سچ مچ یہی احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی سیاح ہوں۔

رزمہ ایک عمدہ لڑکی تھی، خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھی اور پھر

افغانستان کی تاریخ سے کافی دلچسپی رکھتی تھی۔ گرشک سے کچھ فاصلے پر اس نے دریائے میمنہ کے کنارے لشکری بازار اور قلعہ سفید کے کھنڈرات محلات، مسجدیں، حفاظتی برج، فصلیں اور بلند محرابیں صحرا میں بکھری پڑی تھیں اور چونکہ رزمہ کو احساس تھا کہ میں سیاح ہوں اور ان چیزوں سے دلچسپی رکھتی ہوں گی۔ چنانچہ وہ ان کے بارے میں بتا رہی تھی۔

لشکری بازار غزنوی سلطانوں کا سرمائی دارالسلطنت تھا۔ ترکوں کے ہاتھوں سلطان مسعود کی شکست کے بعد جہاں غزنی برباد ہُوا وہاں لشکری بازار کو بھی زوال آ گیا۔ وہ اس علاقے کی تفصیل بتاتی رہی اور میں پوری طرح اس میں دلچسپی لیتی رہی۔ ایک گھنٹہ بس یونہی گزر گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور پھر واپس چل پڑی۔

بہرحال قندھار تک کا سفر انتہائی خوشگوار رہا۔ وہ دونوں انتہائی اچھے ساتھی ثابت ہوئے تھے۔ قندھار میں، مَیں ان سے جدا ہوگئی اس سے زیادہ ان کا ساتھ مناسب بھی نہیں تھا۔ دونوں نے مجھے خدا حافظ کہا اور پھر اپنے راستے پر چلے گئے۔

قندھار میرے لیے نئی جگہ تھی اور میں اس کے بارے میں زیادہ جانتی بھی نہیں تھی۔ بہرصورت اتنی خوداعتمادی تو تھی ہی کہ میں اپنے لیے کسی مناسب راستے کا تعین کرسکوں۔ پھر میں نے خود اعتمادی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ کچے مکانات، تنگ گلیاں اور کہیں کہیں سرو کے درختوں کے جھنڈ۔ کوئی جاذبیت نہیں نظر آتی تھی اس شہر میں۔ میں نے کسی سیاح کے سے انداز میں ہوٹل کی تلاش شروع کر دی اور جو ہوٹل مجھے ملا وہ بہت ہی معمولی سا تھا۔ بہرصورت کم از کم ایک رات تو یہاں گزارنی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے وہی ہوٹل پسند کیا اور اس کے کمرے میں مقیم ہوگئی۔ شاید یہاں تنہا عورتوں کے قیام کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بہت سی حیران نگاہوں کو اپنی طرف نگراں پایا۔

لیکن یہ معمولی سے لوگ تھے۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں میں نے اتنا ضرور کیا کہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد، پھر باہر نہیں نکلی۔ بہرحال وہ رات میں نے اسی گندے ہوٹل میں گزاری۔ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکی تھی۔ بستر میں لیٹی

خیالات میں ڈوبی رہی۔ بے شمار خیالات تھے جو میرے ذہن کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ صبح اُٹھتے ہی ناشتہ تو ضرور کروں گی لیکن اس کے فوراً بعد کابل کا رُخ کروں گی۔ ممکن ہے وہ بہتر جگہ ہو۔ وہاں سے کوئی آئندہ پروگرام بنایا جا سکتا تھا۔

بڑی طویل رات تھی۔ خیالات کا تار تھا کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن اس کے باوجود رات گزارنی مشکل ہوگئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ہوٹل کے گندے سے ویٹر سے میں نے ناشتہ طلب کیا اور اُلٹا سیدھا ناشتہ کرنے کے بعد اسی سے کابل جانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔

معلوم ہوا کہ بسیں چلتی ہیں۔ اس کے علاوہ کابل تک جانے کا کوئی اور بندوبست نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لوں۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے ہوٹل سے باہر نکلنے کے بعد کرنسی تبدیل کرانے کی سوچی اور ایک اچھی خاصی رقم افغانستان کی کرنسی میں تبدیل کرا لی۔ باقی رقم میں نے اسی شکل میں محفوظ رہنے دی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنے لیے کچھ لباس خریدے جو زیادہ اچھے تو نہیں تھے لیکن بہرصورت ان سے کام چل سکتا تھا۔ بالوں کے اسٹائل میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی اور کچھ اس انداز کا تھوڑا سا سامان خرید لیا جس سے میرے سیاح ہونے میں کسی کو شبہ نہ ہو۔ البتہ کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت باقی رہ گئی تھی جیسے پاسپورٹ یا میرے کاغذات کہیں بھی مجھ سے طلب کیے جا سکتے تھے لیکن ان کے لیے بھی میں کوئی کہانی سنا سکتی تھی۔ ظاہر ہے میں ان تمام چیزوں کا بندوبست تو نہیں کرسکتی تھی۔ ایک انتہائی غلیظ اور بے تکی بس میں بیٹھ کر میں کابل کو چل پڑی اور یہ سفر اس دوران کا سب سے گندا سفر تھا۔ جس نے مجھے بُری طرح تھکا کر رکھ دیا۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے کابل تک کسی کار میں لفٹ مل جائے لیکن یہ خطرہ بار بارہ مول لینا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ خدا خدا کر کے کابل میں داخل ہوئی۔

قندھار جیسے شہر کی نسبت وہ شہر انتہائی خوبصورت اور مناسب تھا۔ دریائے کابل

شہر کے درمیان بہہ رہا تھا۔ یہاں مجھے ہوٹل کی تلاش میں دقت پیش نہیں آئی اور جس جگہ میں نے قیام کیا وہ خاصا جدید طرز کا اور خوبصورت ہوٹل تھا۔ ہوٹل کے کشادہ اور وسیع کمرے میں آنے کے بعد میں نے سکون کی سانس لی۔ غسل کیا اور نیا لباس پہن لیا۔ ذہن سے منوں بوجھ ہٹتا ہُوا محسوس ہُوا تھا۔ پھر میں نے دیوار میں لگی ہوئی گھنٹی بجا کر ویٹر کو بلایا اور آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔ ویٹر مقامی ہی تھا لیکن صاف ستھرے لباس میں ملبوس، انگریزی سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کافی طلب کی۔ تھوڑی دیر کے بعد عمدہ کافی کے برتن میرے سامنے پہنچ گئے۔ بدن میں عجیب سی کاہلی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن بہرحال اتنی ہمت نہ پڑی کہ ویٹر سے کافی بنانے کے لیے کہوں۔ چنانچہ اس کے جانے کے بعد خود ہی اُٹھی اور کافی بنا کر اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ بہرصورت یہ تو طے شدہ بات تھی کہ میں کابل میں نہیں رہ سکتی تھی۔ افغانستان میرے لیے خطرناک حیثیت رکھتا تھا کہ ایران سے ملا ہوا تھا اور اگر میری تلاش زیادہ زور وشور سے ہوئی تو یہاں مجھے تلاش کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مجھے تلاش کرنے والوں میں دو بااثر انسان تھے۔ ہارون ملی کا باپ اور خود میرے والد صاحب۔ ظاہر ہے دونوں ہی میری تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ بڑی عجیب کیفیت ہوگئی ہوگی ان کی دوستی کی۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا اور پھر بے ساختہ میرے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ ہارون ملّی، بیوقوف کہہ رہا تھا کہ اب تم میرے تصرف میں ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے اور شادی کیسی بے تکی بات تھی۔ ایک شخص کے محکوم ہو کر رہ جاؤ۔ اپنی سوچ ترک کر دو، اپنے مشاغل ترک کر دو، صرف اس کے لیے زندہ ہو۔

ہونہہ، میں نے تو شادی کا اقرار صرف اس لیے کیا تھا کہ ممکن ہے اس زندگی میں کوئی تبدیلی ہو، لیکن وہاں تبدیلی کیا نظر آئی تھی، کچھ بھی نہیں۔ فضول سی باتیں، فضول سی رسمیں، خواہ مخواہ وہ احمق مجھ سے فضول باتیں کر رہا تھا۔ بہت اچھا کیا میں نے جو اُسے زندگی کے بوجھ سے آزاد کر دیا اور پھر اس کے بعد افتخاری نفرت انگیز

انسان۔ بھلا وہ بھی کوئی انسان ہے جو اپنا مافی الضمیر کہنے کی بجائے لرزنا اور کانپنا شروع کر دے۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور آئندہ کے لیے سوچنے لگی۔

جانا کہاں چاہیے؟ بظاہر یہاں تو جس انداز میں آ گئی تھی، لیکن یہاں سے باہر نکلنے کے لیے پاسپورٹ بے حد ضروری تھا۔ اس کے علاوہ زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ضرور متعین کرنا تھا۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ ہمیشہ تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ٹھیک ہے دنیا گردی کی جائے لیکن اس کے لیے ذرائع آمدنی کیا ہوگا۔ میرے ذہن میں بہت سے خیالات گھوم گئے۔ خوبصورت لڑکیوں کے لیے کسی بھی شہر میں دولت کی کمی نہیں ہوتی لیکن کیا وہ زندگی مناسب ہوگی خاص طور پر مجھ جیسی لڑکی کے لیے۔

شاید میں لوگوں کا دل بہلانے کے لیے وہ سب کچھ نہ کر سکوں جس سے دولت حاصل ہوتی ہے لیکن پھر بھی دولت کی ضرورت تو پیش آئے گی۔ ہونہہ۔ اس کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہی سب کچھ کیا جائے جو دوسرے کرتے آئے ہیں۔ تھوڑی سی ذہانت، تھوڑی سی چالاکی اور پھر ان مردوں کو احمق بنانے کون سا مشکل کام ہے۔ میں دل ہی دل میں مسکرا اُٹھی۔ جس کام کو میں نے بے حد مشکل سمجھا تھا۔ وہ مشکل تو نہیں تھا جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

کابل کے اس پہلے ہوٹل کی رات نسبتاً پُرسکون تھی، آج میں نے زیادہ سوچنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ذہن کو خیالات سے آزاد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اب تو عملی زندگی شروع ہو چکی تھی اب تردّد سے کیا فائدہ جو راتوں کو جگاتا ہے۔ میں نے ہر قسم کے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چنانچہ نیند آ گئی اور جب بھرپور پُرسکون نیند آ جائے تو صبح خود بخود حسین ہو جاتی ہے چنانچہ دوسری صبح غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی مین کوئی پریشانی ہے ہی نہیں۔

اور یہ حقیقت تھی۔ میں پریشان تو تھی ہی نہیں۔ اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی اور جس قسم کی میری فطرت تھی۔ اس کے مطابق یہ زندگی تو مناسب تھی۔ کسی مرحلے پر اگر

کوئی خاص دشواری پیش آ جاتی تو میں اسے بھی اپنی مہم کا ایک حصہ سمجھتی۔ ہر دشواری کا ایک حل ضرور ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر۔

ویٹر کو بلا کر میں نے ناشتہ طلب کیا اور بڑے اطمینان سے ناشتہ کیا، مسئلہ یہ تھا کہ کابل سے نکلنے کی کیا کوشش کی جائے لیکن اس کے لیے فوری طور پر بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ سوچنا تھا اور ناشتہ کے دوران بھی میں اس بارے میں سوچتی رہی۔ پھر میں نے سوچا کہ غور وخوض میں سر کھپانا ایک بیکار سی بات ہے باہر نکل کر دیکھا جائے گا۔ حالات کے ساتھ ساتھ قدم بڑھائے جائیں اور حالات جس طرف لے جائیں میرے خیال میں اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، ہاں مجھے کچھ کرنا تھا تو اتنا ضرور کہ خود کو پولیس کی نگاہوں سے بچائے رکھوں۔ ظاہر ہے میں نے دو قتل کیے تھے اور میری تلاش یقیناً جاری ہوگی۔

قدِ آدم آئینہ کے سامنے میں نے اپنا حلیہ دیکھا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کافی تبدیلیاں ہوگئی ہوں۔ بالوں کے اسٹائل میں تبدیلی تھی اور لباس مختلف انداز میں پہننے سے بھی فرق پڑا تھا، جو لوگ مجھے ہمیشہ سے دیکھتے ہوں گے وہ مجھے اس حلیے میں دیکھ کر تذبذب کا شکار ضرور ہو جاتے کہ میں ہوں بھی یا نہیں۔

بہر حال میں باہر نکل آئی۔ نئے کابل کی گلیاں اور بازار مخصوص طرز کے تھے۔ مجھے پسند بھی آئے اور میں انہیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ دو ایک دوکانوں پر رک کر میں نے کچھ خریداری بھی کی، میری کیفیت بالکل کسی سیاح کی سی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے پر یہ دباؤ نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور کس مقصد سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں، کیا کر چکی ہوں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ میری مضبوط فطرت کا ایک پہلو تھا۔

مغرب کی طرف رومانوی کوہ بابا کی برف پوش چوٹیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں اور اتنی نزدیک محسوس ہوتی تھیں کہ ہاتھ بڑھائیں اور چھو لیں۔ اس کے ساتھ مشرقی شمال کی طرف ناقابلِ تسخیر خنک اور بلند سلسلہ کوہ کی برف پوش دیوار کھڑی ہوئی تھی جسے افغانی کوہ ہندوکش کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک ایسا پہاڑ جو ہندوؤں کے لیے پیغامِ اجل تھا۔ زمانہء قدیم میں یونان کی قلعہ نما پہاڑیاں دیوتاؤں کا مسکن

سمجھ کر پوجی جاتی تھیں لیکن یہ پہاڑ جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دیکھے جانے کے قابل تھا۔ میں اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ پھر نجانے کب تک میں گلیوں، سڑکوں اور کوچوں میں ماری ماری پھرتی رہی۔ کوئی احساس نہیں تھا کوئی خیال نہیں تھا، بس یوں لگ رہا تھا جیسے درحقیقت میں کوئی سیاح ہوں اور اپنے وطن سے سیر و تفریح کی غرض سے نکلی ہوں۔

یہاں کابل کی خواتین کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ منی سکرٹ اور اونچی ایڑی کے جوتوں میں ملبوس خواتین نظر آ رہی تھیں۔ چادر سکڑ کر جدید وضع کے اسکارف میں تبدیل ہو چکی ہے۔ روایتی لباس کابل میں کہیں نظر نہیں آتا۔ پرانی وضع دار خواتین بھی سکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس نظر آتی تھیں البتہ انہوں نے اتنا ضرور کیا ہوا تھا کہ اپنے منی سکرٹ اور بلاؤز کو شٹل کاک نما برقعے سے ڈھانپ لیا تھا۔ کابل کی تاریخ نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہزاروں سال قبل ان پہاڑوں کے دوسری طرف جڑواں شہر کنیش اور کپشیا آباد تھے۔ سکندر یہاں آیا تو اس نے ایک یونانی شہر کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد کشان نے اسے جمنا اور جیہون کے درمیان پھیلی ہوئی سلطنت کا صدر مقام قرار دیا۔ یہی کشان کے زمانے میں بدھ مت ہندوستان اور وسط ایشیا کے راستے چین تک پھیل گیا۔ وادئ بامیان میں مہاتما بدھ کے سینکڑوں فٹ بلند مجسمے اسی دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ بدھ اور یونانی تہذیب کے ملاپ نے فن گندھارا کو جنم دیا۔ ان شہروں سے پرے بدخشاں کی روسی سرحد کے ساتھ دریائے جیہوں، جسے آمو اور آکسس کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا ایرانی اور تورانی تہذیبوں کے درمیان سرحد بن کر بہتا ہے اور اس کے دامن میں بلخ آباد ہے۔ مولانا روم کی جائے ولادت جسے چنگیز اور تیمور کے قہر نے شکستہ میناروں، اُجاڑ معبدوں اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے ڈھیر میں بدل دیا۔

میں کابل میں کھو گئی تھی۔ دوسری باتیں بھول گئی۔ نہ جانے کب تک آوارہ گردی کرتی رہی۔ نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھرتی رہی۔ پھر جب ہوش آیا تو سامنے ہی ایک خوبصورت پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹا سا خوبصورت ریستوران

نظر آیا جس پر علی بابا لکھا ہوا تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی اس لیے ریستوران کی طرف بڑھ گئی۔

صاف ستھرا ایئر کنڈیشنڈ ریستوران جس کی اس علاقے میں توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہال زیادہ کشادہ نہیں تھا اور اس میں جو لوگ نظر آئے ان میں ایک بھی مقامی نہیں تھا۔ شاید مقامی لوگ گرانی کی وجہ سے یہاں نہیں آتے تھے۔ جس کا اندازہ مجھے بہت جلد ہو گیا۔ یعنی اس وقت جب میں نے مختصر سی کھانے پینے کی چیزوں کا بھاری بل ادا کیا۔

پھر میں ہوٹل سے اُٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ میری نگاہ سامنے کی میز پر پڑ گئی۔ اس سے قبل بھی میں نے ایک سرسری نگاہ اس طرف ڈالی تھی اور ایک نوجوان کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا لیکن اس وقت میں نے اس طرف توجہ نہ دی تھی۔ البتہ اس بار جب میں نے اسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔

خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ بھوری آنکھوں کی وجہ سے اور حسین معلوم ہو رہا تھا۔ جسم پر نہایت حسین تراش کا لباس تھا۔ بالوں کا اسٹائل بھی پیارا تھا۔ میں اس سے نگاہیں ملائے دیر تک اسے دیکھتی رہی اور وہ مسکرایا۔ پھر وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر میرے نزدیک آ گیا۔

''باہر کے موسم سے بہتر یہاں کا ماحول ہے۔ میرا خیال ہے آپ اُٹھنے کا ارادہ کر رہی ہیں؟'' اس نے کہا اور میں اس کی بیبا کی پر ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئی لیکن دوسرے لمحے میرے ذہن میں بہت سے خانے کھل گئے۔ اس وقت اس سے اجتناب حماقت ہوگا۔ اس اجنبی ماحول میں کسی کو دوست بنانا ضروری ہے۔''

''ہاں لیکن تنہائی میں ہر ماحول یکساں ہوتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے بیٹھنے کی اجازت ملے گی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔ اپنی اس بھول پر شرمندہ ہوں۔ تشریف رکھیے۔''

''شکریہ۔'' وہ بیٹھ گیا۔ ''تنہائی دور کرنے کی جرأت کرنی چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں۔ لیکن ساتھی بھی تو سلیقے کا ہو۔''

''آپ کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں ناکام رہیں۔''

''تلاش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''تب میں نے جرأت کی بات درست کہی تھی۔'' وہ بھی مسکراتا ہوا بولا۔

''شاید!''

''ویسے آپ مقامی معلوم نہیں ہوتیں؟''

''ہاں۔ میں ایرانی ہوں۔''

''غالباً سیاح ہیں۔ آپ کے ساتھی دوسرے علاقوں میں نکل گئے ہوں گے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں اور نہ جانے کب وہ ان علاقوں سے واپس آئیں گے۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میں نہیں سمجھا خاتون؟'' اس نے تعجب سے کہا۔

''ساتھیوں کی بات کر رہی تھی۔ میرے دوسرے ساتھی دوسرے علاقوں سے کبھی میرے پاس نہیں آئے۔ لیکن مجھے ان کا انتظار ہے شاید کبھی آ ہی جائیں۔ کبھی کبھی اُداس ہوتی ہوں تو سوچتی ہوں ممکن ہے ان کا وجود ہی نہ ہو۔'' میں خاموش ہو گئی۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد کافی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''شاید آپ تنہا ہیں؟''

''ہاں۔ شاید میں تنہا ہوں اور شاید ہمیشہ تنہا رہوں گی۔'' میں نے ایک سسکی سی لے کر کہا۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے خاتون۔ لیکن میں آپ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں۔''

''مذاق اُڑائیں گے میرا؟'' میں نے اسی انداز میں کہا۔

''ہرگز نہیں۔ میں محسوس کر چکا ہوں کہ آپ عام خواتین سے مختلف ہیں۔ میں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ آپ کا کھویا کھویا انداز ماحول سے بے تعلق مجھے عجیب

سی لگ رہی تھی۔"

"میں کبھی کبھی محسوس کرتی ہوں کہ زمین پر میں اجنبی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں کسی سیارے سے زمین پر آ پڑی ہوں اور اب کبھی وہاں واپس نہیں جا سکتی۔ مجھے اسی زمین پر دفن ہونا پڑے گا۔"

"سیارے سے؟" نوجوان حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ ورنہ تم بتاؤ اگر میرا تعلق زمین سے ہوتا تو اس زمین پر میرا کوئی تو ہوتا۔ کسی کو تو میں اپنا ساتھی کہہ سکتی۔ آخر میں کسی کے ہاں تو پیدا ہوئی ہوں گی۔ کہاں رہ گئے۔ کون تھے وہ؟" میری آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔ نہ جانے کیوں نکل آئے تھے یہ آنسو۔ کوئی خیال تو تھا نہیں ذہن میں اور نہ میرے الفاظ کا حقیقت سے کوئی تعلق تھا لیکن اب شاید میں فطری طور پر اداکارہ بنتی جا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے غمگین ہوں۔" نوجوان نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ تمہارا شکریہ۔ تمہارے یہ الفاظ میرے لیے بیحد قیمتی ہیں۔" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"نہیں ڈیئر۔ میں دل سے کہہ رہا ہوں تمہیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک تاثر اُبھرا تھا لیکن میں تمہارے پاس آنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ اب جب میں تمہارے پاس آ گیا ہوں تو مجھے خود سے دُور نہ کرو۔"

"میں نہیں سمجھی؟" میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"خاتون! آپ نے جو کچھ کہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تنہائی کا شکار ہیں اور شاید پوری دنیا میں آپ کا کوئی نہیں ہے!"

"ہاں یہ درست ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ذاتیات کے بارے میں کچھ سوالات کروں؟"

"کیا فائدہ ہوگا اس سے؟" میں نے اُداس لہجے میں کہا۔

"آپ دنیا سے اس قدر مایوس کیوں ہیں؟ آپ کی تنہائی کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے تنہائی کے احساس نے آپ کو لوگوں سے متنفر کر دیا ہے۔ آپ

سوچتی ہوں کہ دنیا میں آپ کا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے ہر وہ شخص جو بعض اوقات خلوصِ دل سے بھی آپ کی طرف بڑھتا ہو، صرف اجنبیت کے احساس کے تحت آپ کے لیے قابلِ اعتنا نہ ہوتا ہو۔"

"میں نہیں جانتی۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" نوجوان نے پوچھا۔

"شاہینہ!" میں نے جواب دیا۔

"میرا نام ٹونی فوسٹر ہے۔ ہالینڈ کا باشندہ ہوں لیکن طویل مدت سے میرے ڈیڈی برطانیہ میں مقیم ہیں۔ میں تو پیدا بھی انگلینڈ میں ہی ہوا ہوں۔ تم مجھے ٹونی کے نام سے پکار سکتی ہو۔"

"اوہ۔ تم کابل کب آئے؟"

"تقریباً دس روز ہو گئے۔ دراصل میرے ڈیڈی کی مشروبات بنانے کی بہت بڑی فرم ہے لندن میں۔ میں یہاں اکثر آتا رہتا ہوں۔ ہم یہاں سے پھل خریدتے ہیں۔ اپنی نگرانی میں یہاں سے پھل بھجواتا ہوں آج کل بھی اسی سلسلہ میں آیا ہوا تھا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"خوب۔ عمدہ انسان ہو۔ کم از کم ہمدردی سے گفتگو کر لیتے ہو۔" میں نے ایک حزنیہ سی مسکراہٹ سے کہا۔

"اپنے بارے میں اور کچھ نہیں بتاؤ گی؟" اس نے کہا۔

"کیا بتاؤں ٹونی۔ مختصر الفاظ میں میری کہانی یوں ہے کہ دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد میں نے خود کو ہمیشہ تنہا پایا۔ ایک ایسے پودے کی مانند زندگی گزاری جو کسی ویرانے میں اُگ آئے اور جس کی پرورش کرنے والا صرف ہوا اور شبنم ہوں...... بے زبان، بے زبان اور پھر ساری دنیا کی بے زبانی میرے حصے میں آ گئی۔ لوگ ملے لیکن سب کے سب اجنبی۔ زندگی گزارنے کے طریقے سیکھے۔ لیکن خود کو ہمیشہ دوسروں سے الگ تھلگ پایا لیکن...... نہ جانے کیوں یہ حسرت عادت نہیں بن سکی۔ عادت بن جاتی تو اچھا تھا۔

''ایسی باتیں نہ کرو شاہینہ۔ دنیا کو خود سے اتنی دُور نہ سمجھو۔ دنیا اتنی دور نہیں۔''

''پھر بتاؤ۔ اس کے کون سے سرے پر جا کر کھڑی ہوؤں۔ کہاں اپنائیت تلاش کروں۔ لوگ کس طرح اپنے بن جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور میری آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''پلیز شاہینہ! آنسو خشک کر لو ممکن ہے میں تمہارے قابل نہ ہوؤں۔ لیکن میں تمہارے لیے افسردہ ہوں۔ میں تمہارے لیے اپنائیت محسوس کرتا ہوں۔'' اور پھر میں نے اس کی اپنائیت قبول کر لی۔ لندن کا شریف نوجوان مجھے اپنے ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ میں اس کے ساتھ لندن چلوں۔ میں نے تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے میرے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ پاسپورٹ بنوایا۔ لباس بنوائے اور میرے حلیے میں تبدیلی آ گئی۔ میں یہی چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میری شخصیت ہی بدل جائے اور کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔

ٹونی بلاشبہ اچھا انسان تھا۔ وہ مجھ سے اس درجے متاثر ہو گیا تھا کہ بس۔ کبھی میری مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس نے کوئی بات بھی نہ کی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ میرے لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھ سے متاثر ہے۔ بہرحال میں مطمئن تھی۔ دولت کے ذریعے سارے کام ہو جاتے ہیں۔ ہم ساری دشواریوں سے گزر کر لندن چل پڑے۔ اب میرے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ تھا جو میری سب سے بڑی ضرورت تھی۔ کابل سے ٹونی نے میرے لیے بے شمار تحائف خریدے تھے۔ راستے میں، میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے اپنے والدین سے کیا کہہ کر متعارف کراؤ گے ٹونی؟''

''اوہ ڈیئر! میری دوست کی حیثیت سے تم ان کے لیے قابلِ احترام ہو گی۔ اس بات کی فکر کیوں کرتی ہو؟''

''نہیں ٹونی۔ میں ان کے سامنے نہیں جانا چاہتی۔''

''اوہ کیوں۔ آخر کیوں؟''

''تم میرے جذبات کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم نے میری زندگی کا رُخ موڑنے کی جو کوشش کی ہے۔ ان کے درمیان جا کر کہیں یہ احساس اُجاگر نہ ہو جائے کہ میں بہرحال تمہارے درمیان اجنبی ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ٹونی گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ۔ لندن کے ایک خوبصورت علاقے میں میرا ایک عمدہ فلیٹ بھی ہے۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ حالانکہ میرے گھر کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ تمہیں ان کے درمیان ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہ ہوتا لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ میں تمہیں اپنے فلیٹ پر لے جاؤں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا ٹونی مجھے احساس ہے میں تمہارے لیے بہت سی اُلجھنوں کا باعث بنوں گی۔''

''یہ خیال ذہن سے نکال دو ڈیئر۔ مجھے افسوس ہوتا ہے اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ میں تمہیں خود سے مطمئن نہیں کر سکا۔''

''اوہ نہیں۔ تم بے حد مخلص بہت ہی اچھے انسان ہو یقین کرو تم سے مل کر دنیا کے بارے میں میرے خیالات اتنے بُرے نہیں رہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔

طیارے کا اتنا طویل سفر میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ لندن ایئرپورٹ اُتر کر ہم ضروریات سے فارغ ہو گئے اور پھر ایئرپورٹ سے باہر نکل آئے۔ ٹونی نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی ہمارے نزدیک پہنچ گئی۔ پھر ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑے۔

''میں نے گھر والوں کو واپسی کی اطلاع نہیں دی اور یہ بہتر ہی ہوا۔ ورنہ ہمیں ایئرپورٹ پر ریسیو کیا جاتا۔ اب پہلے ہم فلیٹ چلیں گے اور پھر وہاں سے میں گھر چلا جاؤں گا۔''

''مناسب ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

لندن کے ایک خوبصورت علاقے میں ٹونی کا فلیٹ بے حد خوبصورت تھا۔ میں نے اسے پسند کیا۔ آسائش کے سارے سامان کا ساتھ وہاں ایک ملازمہ بھی تھی جو

خاصی چاق و چوبند نظر آتی تھی۔ ٹونی نے اسے میرے بارے میں ہدایات دیں اور پھر کافی دیر تک میرے ساتھ قیام کرنے کے بعد وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ باتھ روم میں جا کر میں نے غسل کیا۔ ذہن کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں ان علاقوں سے بہت دور نکل آئی تھی جو میرے ذہن پر بار تھے۔ میرے پاس کافی سامان تھا اور بین الاقوامی پاسپورٹ بھی۔ گویا میری زندگی کا وہ سنہری دور شروع ہو گیا تھا جس کی میں خواہشمند تھی۔

لیکن۔ زندگی کو کسی ایک شاہراہ پر ڈال کر مطمئن ہو جانا میری سرشت سے باہر کا تھا۔ میں تو نت نئے ہنگاموں کی قائل تھی۔ میں تو ایک ایسی زندگی کی خواہشمند تھی جس کے کسی لمحے پر جمود نہ ہو۔ ملازمہ نے مجھے میری ضرورت کی چیزیں فراہم کر دیں۔ شام کو ٹونی کا فون آیا۔ اس نے شام کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تھا۔

''جیسی تمہاری مرضی ٹونی۔ خود تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟''

''ڈیڈی سے تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ویسے اگر تم تھکن محسوس کر رہی ہو تو آج رات مکمل آرام کر لو۔ اس دوران میں بھی ڈیڈی سے گفتگو مکمل کر لوں گا۔ کل سے ہم لندن کی سیر کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک۔ میں بھی آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا تھا اور اس رات کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں تھوڑی دیر تک ملازمہ سے باتیں کرتی رہی۔ ملازمہ نے بتایا کہ یہ فلیٹ ٹونی کے والدین سے پوشیدہ ہے۔ وہ پرانے خیالات کے لوگ ہیں اس لیے ٹونی کی رنگین راتیں اس فلیٹ میں گزرتی ہیں۔ یہاں اس کی دوست لڑکیاں آتی ہیں اور بعض اوقات اس کے دوست بھی آ جاتے ہیں۔ تفصیل پر مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ٹونی بظاہر شریف اور معصوم سا انسان نظر آتا تھا۔ لیکن یورپ کے معصوم ترین نوجوان بھی ان باتوں سے دور نہیں ہوتے اور پھر میرا اس سے کون سا گہرا تعلق تھا، چنانچہ میں نے اس بات کو ذہن سے نکال دیا جب تک یہاں ہوں ٹھیک ہوں، اس کے بعد میرا اس سے کون سا واسطہ رہ جائے گا۔ ہاں اب یہاں آنے کے بعد مجھے اپنے بارے میں ضرور سوچنا تھا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرا

آئندہ اقدام کیا ہو، یوں تو انٹرنیشنل پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا اور ایک مناسب رقم بھی، چنانچہ میں یہاں سے بآسانی جا سکتی تھی لیکن اس وقت تک لندن میں ٹونی سے دوستی تھی، بہرحال اس کا اپنا کردار کچھ بھی ہو وہ بُرا انسان نہیں تھا۔ میرے لیے تو بہتر تھا۔ میں نے دونوں شانوں کو جھٹکا اور آرام سے لیٹ گئی۔

لیکن رات خیالات کے ساتھ آتی تھی، بے شمار خیالات ذہن کے پردوں سے ٹکراتے تھے اور بعض اوقات تو میں ان خیالات سے پریشان ہو جاتی تھی۔ سب سے بڑا سوال جو میرے ذہن میں آتا تھا وہ یہ تھا کہ کیا میری منزل کوئی ہے اور منزل کے تصور کے بغیر تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا، ہر چیز کی کوئی انتہا ضرور ہوتی ہے اور ہم اس انتہا کی تلاش میں متحرک رہتے ہیں۔

میری انتہا کیا تھی۔ مجھے کہاں تک چلنا تھا اور کہاں رُک جانا تھا یہ سوال کسی کنکھجورے کی طرح میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا اور جب بھی یہ سوال میرے ذہن میں آتا، میں کسی حد تک پریشان ہو جاتی تھی۔

مرد، بلاشبہ میری عمر اب اس قابل تھی کہ میں نوجوان لڑکوں کے بارے میں سوچوں، ان کا قرب پانے کے لیے کوشش کروں۔ میں جی سے چاہتی تھی کہ کوئی اچھی صورت میرے سامنے آئے اور اگر اس انداز سے دیکھا جائے تو ٹونی بھی بُرا انسان نہیں تھا۔ اس کا خلوص، اس کی محبت میرے لیے تھی۔ حالانکہ وہ اسے دوسرا رنگ دیتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ شاید وہ زندگی بھر مجھ سے اظہارِ محبت نہ کر سکے کیونکہ اوّل تو وہ لڑکیوں کا بھوکا نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ میرے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچ رہا تھا جس کا اظہار کئی بار ہو چکا تھا۔

لیکن اگر میں خود چاہوں تو ظاہر ہے ٹونی کی بہت سی مشکلات آسان ہو سکتی ہیں اور پھر اس کے بعد وہ مجھ سے اتنا دور نہیں رہے گا جتنا میں سمجھتی ہوں۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی۔ ہاں یقیناً تھوڑا سا التفات اسے میری طرف متوجہ کر دے گا اور پھر ممکن ہے لندن سے باہر جانے کا خیال چھوڑ دوں۔ مجھے میری پسند کا مرد مل جائے تو ممکن ہے اس کے بعد میرے خیالات میں

تھوڑی سی تبدیلی آ جائے۔ حالانکہ پہلے میرے سوچنے کا انداز کچھ اور تھا۔

ہارون بھی ایک مرد کی حیثیت سے بُرا نہیں تھا، اچھا خاصا تھا، شکل وصورت بھی اچھی تھی اور پھر میرا ہم وطن۔ اچھے حالات بھی رکھتا تھا لیکن اس نے جس انداز میں مجھے ٹریٹ کیا تھا وہ مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ میرا مالک بن بیٹھا تھا جب کہ میں کسی قیمت پر اس چیز کو پسند نہیں کرتی تھی۔ میں تو زندگی میں کسی نمایاں تبدیلی کی خواہش مند تھی اور یہ نمایاں تبدیلی تو مجھے شادی کر کے نہیں مل سکتی تھی۔ پھر میں کیوں اس کے لیے بندھ کر رہ جاتی۔

بندھ کر تو شاید میں ٹونی کے لیے بھی نہ رہ سکوں، شاید دنیا کے کسی مرد کے لیے بھی نہیں کیونکہ میری یہ فطرت کے خلاف تھا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح میں صبح کا ناشتہ کرتی ہوں، دوپہر کو کھانا کھاتی ہوں اسی طرح رات کو ایک مرد مل جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں ہاں۔ یہی تو بہتر ہے۔ افوہ۔ میں نے اس انداز میں پہلے کیوں نہیں سوچا...... مرد میرے ذہن میں جلن سی ہونے لگی۔ زندگی میں اس سے قبل تو کسی نوجوان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

ذہن کی طلب اس قدر بڑھی کہ بستر سے اُٹھ گئی، لباس تبدیل کیا اور بے چینی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ رات بہت زیادہ نہیں گزری تھی لیکن ملازمہ سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں جا سوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور بلڈنگ کی ایک بالکونی میں کھڑے ہو کر سڑک کا نظارہ کرنے لگی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اپنے عقب میں میں نے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید بلڈنگ میں رہنے والا کوئی شخص آ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر آنے والے کو دیکھا۔ درمیانی عمر کا ایک قبول صورت آدمی تھا۔ اچھے تن و توش کا مالک۔ مجھے شب خوابی کے لباس میں اس طرح کھڑا دیکھ کر چونک پڑا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اور پھر آہستہ سے گردن خم کر کے بولا۔

"ہیلو!"

"ہیلو" میں نے دلآویز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ اس فلیٹ میں آئی ہیں مادام" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"میں بھی آپ کا پڑوسی ہوں۔ ایک بینک میں ملازم ہوں اور میرا نام گریڈی ہے۔"

"اوہ۔ تب آیئے۔ ایک کپ چائے پی جایئے۔ عمدہ پڑوسی بڑی نعمت ہوتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس نے دونوں شانے ہلائے۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" وہ آہستہ سے بولا اور میرے ساتھ میرے فلیٹ میں آ گیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر معذرت کرتے ہوئے بولی۔

"چند لمحات کے لیے اجازت دیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا دوں۔ ملازمہ سونے کے لیے جا چکی ہے۔"

"اوہ۔ خاتون چائے کی کیا ضرورت ہے۔ بس تھوڑی گفتگو رہے۔ براہ کرم آپ تشریف رکھیے۔" اس نے کہا۔

"تب میں شراب تلاش کرتی ہوں۔ ممکن ہے یہاں موجود ہو۔" میں نے کہا۔ حالانکہ میں شراب کی عادی نہیں تھی لیکن جانتی تھی کہ لندن میں شراب عام ہوتی ہے اور مجھے اس کی تلاش میں مایوسی نہیں ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے لیے بھی جام بنایا تھا اور شراب کے تین پیگ نے میری ذہنی کیفیت بدل دی۔ لیکن میں ہوش وحواس سے عاری نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے میں نے اس شخص سے کیا گفتگو کی لیکن اتنا یاد ہے کہ جب میں اس کے بالکل قریب پہنچ گئی تو وہ گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"اب مجھے اجازت دیں مس مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

"کہاں جاؤ گے آج رات یہیں رہ جاؤ" مجھے اپنے الفاظ سنائی دیئے۔

"اوہ سوری۔ میری بیوی منتظر ہو گی۔ خدا حافظ۔" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا اور میں کسی زخمی شیرنی کی طرح غرّانے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کمرے کی ہر چیز کو بھنبھوڑ کر رکھ دوں۔ سب کچھ توڑ دوں۔ سب کچھ فنا کر دوں۔ زور زور سے چیخوں۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر اور پھر جو سامنے آئے اسے...... اسے!"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ ڈالے۔ دل چاہ رہا تھا اپنے سارے بدن کو زخمی کر لوں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو خود کو ہی چیر پھاڑ کر پھینک دوں۔ بس میں

اپنے سامنے کسی زندگی کا وجود نہیں چاہتی تھی۔ بے بسی سے چاروں طرف گھومتی رہی اور پھر فلیٹ کے ننگے فرش پر لیٹ گئی۔ میں نے جلتی ہوئی پیشانی ٹھنڈے فرش پر رکھ دی اور سو گئی۔

دوسری صبح مجھے ملازمہ نے جگایا تھا۔ نشہ اُتر گیا تھا لیکن وحشت کم نہیں ہوئی تھی۔ دل کوئی چیز قبول نہیں کر رہا تھا، ایک عجیب سی بحرانی کیفیت ذہن پر طاری تھی۔ بس میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ ملازمہ نے ناشتہ لگایا تو میں نے خاموشی سے ناشتہ کر لیا۔ ناشتے کے بعد میں ایک آرام کرسی میں دراز ہو گئی اور میرا ذہن کھولنے لگا۔

ٹونی میرا محسن ہے۔ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بھی یورپ کے عام نوجوانوں کی مانند ہے۔ لیکن اس نے جس انداز میں مجھ سے اجتناب کیا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ میرے معاملے میں وہ مکمل طور سے مخلص ہے اور کبھی مجھے اپنی ملکیت سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ لیکن میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ اس کی یہ شرافت کہیں اس کی موت کا سبب نہ بن جائے اور بہرصورت ایک اچھے انسان کے لیے یہ بُری سزا ہو گی۔ مجھے خود پر اختیار نہیں تھا۔ میں اپنی وحشت اپنی دیوانگی میں ہر قدم اُٹھا سکتی تھی۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ یہ جگہ چھوڑ دی جائے۔ یہ خیال میرے ذہن پر اس قدر حاوی ہوا کہ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سامان سمیٹا۔ مختصر سا سامان سوٹ کیس میں رکھ کر میں خاموشی سے ملازمہ کو بتائے بغیر ٹونی کے فلیٹ سے نکل آئی۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا، کوئی احساس نہیں تھا کہ کہاں جاؤں گی۔ بس چلتی رہی۔ تھوڑی دور چل کر ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گئی۔

"کسی عمدہ سے ہوٹل لے چلو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا اور اس نے گردن جھکا کر ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ہوٹل گلائیڈر میں پہنچ گئی۔ خوبصورت اور جدید ترین ہوٹل تھا۔ میرا کمرہ کافی خوبصورت تھا۔ مجھے یہاں آ کر کافی سکون محسوس ہوا۔ ساری ضروریات سے فارغ ہو کر میں پھر سوچوں میں ڈوب گئی۔ یہ خیالات ہی میری زندگی کے ساتھی تھے۔ ان کے سوا اور کیا تھا میرے پاس۔ لیکن اب کسی ٹھوس

اقدام کی ضرورت تھی۔ کسی ایسے راستے کا تعین ضروری تھا جو زندگی گزارنے میں معاون ہو۔ گھر کا تو اب تصور ہی ذہن سے نکال دینا تھا۔ ظاہر ہے میں محض گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی نہیں تھی بلکہ اب دو انسانوں کی قاتل بھی تھی۔ اب سہاروں کی تلاش بے سود تھی۔ اب تو ہر قدم نہایت مضبوط ہونا چاہیے تھا۔ میری فطرت...... سچ بات تو یہ ہے کہ میں خود اپنی فطرت سے ناواقف تھی۔ میں اپنے اندر کی اس خواہش کو تلاش کر رہی تھی جو مجھے میری منزل دکھا سکے۔ لیکن...... میری...... منزل کا کوئی نشان میرے ذہن میں نہیں تھا۔

جوانی کے جذبات...... ہاں میں ان جذبات سے عاری تو نہیں تھی۔ میرا دل بھی بعض اوقات انوکھے انداز میں دھڑکتا تھا۔ ایسے انوکھے انداز میں جسے میں خود بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ میرے بدن میں بھی انگڑائیاں ٹوٹتی تھیں اور میرے خوابوں میں بھی سڈول بدن، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، روشن چہرے اور بالوں بھرے سینے آتے تھے لیکن نہ جانے کیوں...... دل اندر سے کسی نوجوان کا قرب قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔

بہرحال زندگی اب تک اتفاقات کے سہارے چل رہی تھی لیکن پوری زندگی اتفاقات کے سہارے تو نہیں چل سکتی تھی۔ اتفاقات سے الگ کی زندگی بھی تو تلاش کرنی تھی کرنسی بھی زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا ضروری تھا اور گلائیڈر کے اس کمرے میں لیٹے لیٹے میں نے نہ جانے کیا کیا سوچا۔ ہمت کی میرے اندر کمی نہیں تھی۔ جو سوچتی تھی اسے کرنے کی ہمت رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک دلچسپ منصوبہ میرے ذہن میں آ گیا اور میں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔ میں نے اپنے اندر کی قوتوں کو آواز دی اور انتظار کرنے لگی کہ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں کر بھی سکوں گی یا نہیں؟

اور مجھ جیسی لڑکی کوئی کام سوچے اور نہ کر سکے، اس کا کیا سوال تھا۔ چنانچہ میں خود کو ٹھونک بجا کر تیار ہو گئی اور اس کے بعد میں نے پورا دن سکون سے گزارا۔ رات کو میں نے لباس تبدیل کیا اور اپنے کمرے سے نیچے آ گئی۔ ڈائننگ ہال گوناگوں دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں بھی اپنی میز پر بیٹھ گئی۔

یہاں بیٹھ کر میں نے چند چیزیں خصوصی طور پر نوٹ کیں۔ اول یہ کہ میرے لباس یہاں کے فیشن کے مطابق نہیں ہیں۔ دوسری لڑکیاں نت نئے لباسوں میں ملبوس نظر آ رہی ہیں۔ دوم یہ کہ یہاں کی زندگی کافی مختلف ہے۔ یہاں ریزرو رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جام خود بڑھ کر اُٹھانا ہوگا اور بہرحال میرے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ اس رات میں نے صرف حالات کا جائزہ لیا اور واپس آ گئی۔ دوسرے دن سب سے پہلے میں نے یہی کام کیا تھا کہ بازار گئی اور چند سِلے سلائے جوڑے خریدے اور چند جوڑوں کا کپڑا خریدا اور اسے ٹیلرنگ ہاؤس کو دے دیا۔ پھر ایک ہیئر ڈائنگ ہاؤس گئی اور وہاں سے بالوں کا رنگ تبدیل کرایا۔ میرے بال گہرے براؤن سے گہرے سیاہ ہو گئے۔ پلکیں اور بھنویں بھی بنوائیں اور پھر آئینہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ درحقیقت میرے اندر زبردست تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف مجھے پہلے سے زیادہ خوشنما بنا دیا تھا بلکہ میرا چہرہ اس قدر بدل گیا تھا کہ کوئی بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ لیکن آج کے اخراجات اتنے زبردست تھے کہ دماغ درست ہو گیا۔ میری مالی حالت زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن بہرحال جو کچھ میں نے سوچا تھا اس کے بعد میں قلاش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر میں ایک میڈیکل سٹور میں داخل ہو گئی۔ کتابی معلومات کے مطابق میں نے کچھ مخصوص چیزیں خریدیں جو میرے لیے بے حد کارآمد تھیں اور پھر اس کے بعد میں اپنے ہوٹل واپس آ گئی۔

اپنے طور پر میں ہر طرح سے مکمل ہو گئی تھی۔ چنانچہ رات کو میں مکمل طور سے آراستہ ہو گئی۔ جدید طرز کے سلے ہوئے حسین لباس لندن کی دوشیزاؤں کو تو سجاتے ہی تھے، میرے نوخیز بدن پر آ کر نہ صرف میری بلکہ ان کی شان بھی کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اور میں نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا کہ فضا میرے لیے بہت سازگار ہے۔ میں اپنی میز کی طرف بڑھ گئی اور پھر بڑی نزاکت سے بیٹھ گئی۔ اسٹیج پر ایک مغنیہ کوئی طربیہ نغمہ گا رہی تھی۔ چاروں طرف شیشے کھنک رہے تھے۔ بے شمار نگاہیں میرا طواف کر رہی تھیں۔ لیکن آج میں انوکھے رنگ میں تھی۔ میں ایک عزت دار باپ

کی بیٹی تھی لیکن میرا باپ شاید میری مناسب تربیت نہیں کر سکا تھا۔ میں نہیں جانتی خرابی کہاں ہوئی تھی بہرحال میں اس وقت ایسے رنگ میں بیٹھی تھی کہ اگر میرے باپ کو اس بارے میں معلوم ہو جاتا تو خودکشی کر لیتا۔

سب سے پہلے جرأت کرنے والا ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا۔ خاصا قبول صورت اور تندرست تھا۔ لیکن میرے تجربے کے مطابق جس کام کے لیے میں نکلی تھی، اس کے لیے اس قسم کے نوجوان ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے اُسے نظرانداز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیا آپ تنہا ہیں خاتون؟'' اس نے بڑی شرافت سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ فرمایئے۔''

''میں بھی تنہا ہوں۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''کیوں نہ ہم دونوں اپنی تنہائی دُور کر لیں؟''

''مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ چونک پڑا۔

''اوہ...... کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔''

''کمال ہے، حالانکہ تنہائی زندگی کی قاتل ہوتی ہے۔''

''براہِ کرم آپ اپنے ان خوبصورت جملوں سمیت یہاں سے اُٹھ جایئے۔''

اس بار میں نے سخت لہجہ اختیار کیا اور نوجوان متحیرانہ انداز میں میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کتنی نگاہوں نے اس کی اس بے عزتی پر غور کیا ہے۔ پھر وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھ گیا۔ کہیں اور سے اس کے لیے ایک آوازہ بلند ہوا تھا۔

میں نے ویٹر کو اشارہ کیا اور قریب آنے پر اس سے ایک مشروب طلب کیا، ویٹر چلا گیا تو میں نے ہال میں نگاہیں دوڑائیں۔ نوجوان شاید بے عزتی کے احساس سے ہال سے باہر چلا گیا تھا۔ میری نظریں درمیانی عمر کے ایک شخص پر مرکوز ہو گئیں جو اعلیٰ

درجے کے لباس میں ملبوس تھا اور اچھا خاصا باوقار نظر آ رہا تھا۔

حالانکہ زندگی میں پہلی بار میں نے اس طرف قدم بڑھائے تھے لیکن اتنا اندازہ لگا لیا کہ خاصی عمدہ حیثیت کا انسان ہے اور میں بے خیالی میں اسے دیکھنے لگی۔

درمیانی عمر کے شخص نے بھی کئی بار مجھے دیکھا اور پھر اس کے انداز میں کسی حد تک بے چینی نظر آنے لگی۔ گویا میں اسے بے کل کر چکی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس مسکراہٹ کو اس نے نہ جانے کیا سمجھا۔ بہرحال میری اس بے معنی مسکراہٹ نے میری مشکل حل کر دی تھی۔ وہ شاید خود تو میرے نزدیک آنے کی جرأت نہیں کر سکا کیونکہ نوجوان کا حشر دیکھ چکا تھا لیکن چند ساعت کے بعد ایک ویٹر میرے نزدیک پہنچ گیا۔

''معاف کیجئے گا میڈم۔ اس میز پر آپ کے شناسا مسٹر جم موجود ہیں۔ ان کا پیغام ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کے پاس چلی جائیں۔'' اس نے اُس شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ۔ ہاں مسٹر جم۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ کا مشروب اسی میز پر پہنچا دوں؟''

''نہیں۔ کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی کرسی سے اُٹھ گئی۔ درمیانی عمر کے شخص کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ جوں جوں میں اس کے قریب پہنچ رہی تھی وہ سنبھلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ کرسی سے اُٹھ گیا۔

''ہیلو۔ تشریف رکھیے محترمہ!'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''شکریہ!'' میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ کے لیے کیا منگاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ویٹر سے کہا اور ویٹر جو میرے لیے کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گردن خم کر کے چلا گیا۔ ''آپ کو تکلیف دے کر شرمندہ ہوں۔ خود اس لیے حاضر نہ ہوا تھا کہ ممکن ہے کہ آپ بات کرنا پسند نہ کریں۔''

''اوہ۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔!''

''ویسے آپ تنہا ہیں؟''

''ہاں۔''

''دراصل ایک شخص نے آپ کے قریب پہنچنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ بولا۔

''سوچنے کا فرق ہے مسٹر جم۔ ویٹر نے مجھے آپ کا نام یہی بتایا تھا۔''

''ہاں میرا نام جم براؤن ہے۔''

''میں سیکاریا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ مس سیکاریا میں آپ کے وطن کا تعین نہیں کر سکا۔''

''استنبول!''

''اوہ۔ خوب، میں آپ کے خدوخال سے اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ مقامی تو نہیں ہیں۔''

''جی ہاں۔ لندن میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔''

''یہاں آنے کی غرض؟''

''سیاحت کے سوا کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔ ہاں تو آپ سوچنے کے فرق کا تذکرہ کر رہی تھیں۔'' مسٹر جم نے یاد دلایا۔

''ہاں۔ مجھے ان نوجوانوں میں ذرا بھی دلکشی نظر نہیں آتی۔ ناہموار مزاج کے مالک۔ قطعی ناقابلِ اعتبار۔ زندگی کے تجربات سے عاری۔ آپ یقین کریں میں نے آج تک کسی نوجوان کو قریب نہیں آنے دیا۔''

''پختہ سوچ ہے آپ کی!'' مسٹر جم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ خود ہی غور کریں۔ زندگی کی تعمیر تو ہو نہیں پاتی۔ دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں اور دوڑ پڑتے ہیں لڑکیوں کے پیچھے۔ لیکن اس کے برعکس آپ کے الفاظ میں کتنا حسن ہے۔ آپ کے بات کرنے کے انداز میں کتنا ٹھہراؤ ہے۔ مسٹر جم یقین کریں میں یہ باتیں دل سے کہہ رہی ہوں۔'' ان فقروں کے بعد تو مسٹر جم کی طرف

سے عنایات ہی عنایات تھیں انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں اور میں نہایت صفائی سے جھوٹ بولتی رہی۔

"میں آپ سے بے حد متاثر ہوا ہوں مس سیکاریا۔ یہاں میرے وطن میں آپ اجنبی ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟"

"میں مالی پریشانیوں کا شکار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ ظاہر ہے دوٹوک بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"اوہ۔ مجھے آپ کے ساتھ تعاون کر کے دلی مسرت ہو گی۔ میں آپ کی پریشانیاں دور کر دوں گا۔" جم نے جواب دیا۔

"بس اس کے علاوہ سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گی؟"

"ابھی اس وقت؟"

"ہاں!" جم کاروباری انداز میں بولا۔ صاف گوئی کے جواب میں اس نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا اور بہرحال یہ بات مجھے پسند آئی تھی۔

"ہاں۔ میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ ہم حقیقت کی دنیا کے لوگ ہیں۔ میں بھی دو اور دو چار کی قائل ہوں۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ میری آپ سے کیا رشتے داری ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"یہ آپ کی مزید خوبی ہے۔ تو پھر اُٹھیں۔"

"چلیئے!" میں نے کہا اور ہم ہال سے باہر نکل آئے۔ مسٹر جم کی کار لمبی اور خوبصورت تھی اور ان کی رہائش گاہ بھی ان کی مالی حیثیت کی مظہر۔ حسین ترین خواب گاہ۔ میں نے بہت پسند کیا تھا اور مسٹر جم بے حد خوش اخلاق انسان تھے۔ چنانچہ انہوں نے کئی ہزار پونڈ کے نوٹ میرے پرس میں ٹھونس دیئے اور میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اور اس کے بعد میری زندگی کی پہلی رنگین رات شروع ہو گئی۔ وہ رات جو میری زندگی میں اجنبی تھی۔ لیکن جس رات کے لیے میرے ذہن میں کوئی خوشگوار تاثر نہیں تھا بلکہ جس رات کے ساتھی کے لیے میرے دل میں بڑے مضحکہ خیز تاثرات تھے۔ مسٹر جم

نے عمدہ قسم کی شراب کی بوتلیں میز پر سجا دیں۔ میرے لیے انہوں نے رات کے پہننے کا لباس بھی مہیّا کیا تھا جو بے حد خوبصورت تھا اور پھر شراب کا دور چلا۔ میں نے مسٹر جم کو بتا دیا کہ میں زیادہ شراب نہیں پیتی۔ دو ایک پیگ میں ان کا ساتھ دوں گی۔ ہاں انہیں، میں جب تک کہیں، شراب پلا سکتی ہوں۔ مسٹر جم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا اور پیتے رہے۔ پیتے رہے اور اپنا وقار کھوتے رہے۔ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے چنانچہ اب میں ان کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس دوران میں اپنا کام شروع کر چکی تھی۔ چنانچہ ہائیڈروسیریم کی ننھی سی سفید گولی میری چٹکی میں دبی ہوئی تھی اور پھر وہ مسٹر جم کے ایک گلاس میں منتقل ہو گئی۔ مسٹر جم نے شراب کا وہ گلاس بھی پی لیا اور پھر ان کی انتہا ہو گئی۔

شراب کا دور ختم ہوا۔ اب انہیں شباب کی طلب تھی جس کے لیے میں نے خود کو بخوشی پیش کر دیا۔ مسٹر جم میرے اس تعاون سے نہال ہو گئے لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ خود ان کی فطرت ان سے تعاون نہیں کر رہی۔ وہ حیران رہ گئے۔ پاگل ہو گئے۔ کیا کیا جتن نہ کئے انہوں نے لیکن ہائیڈروسیریم زندہ باد۔ اسی نے مسٹر جم کو چت کر لیا۔

میرا کیا قصور تھا۔ مسٹر جم کچھ بھی تو نہ کہہ سکے۔ خود پر جھلا رہے تھے۔ خود سے شرمندہ ہو رہے تھے۔ پھر وہ خود بھی چت ہو گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں پوز کرنے لگے جیسے زیادہ شراب برداشت نہ کر سکے ہوں۔ میں نوجوان ہونے کے باوجود، ناواقف ہونے کے باوجود پُرسکون تھی۔ کیونکہ میں نے تو اس سلسلے میں باقاعدہ پروگرام بنایا تھا۔

بہرحال اب مسٹر جم کی طرف سے تو کئی روز تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تقریباً ایک ہفتے کے لیے سرد ہو چکے تھے۔ چنانچہ میں اطمینان سے سو گئی۔ صبح ہوئی تو مسٹر جم بستر سے غائب تھے۔ ہاں ناشتے پر ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ شرمندہ شرمندہ سے تھے۔ لیکن میں نے اپنے چہرے سے ذرا بھی اس قسم کا اظہار نہ ہونے دیا کہ ان کی رات کی ناکامی میرے ذہن میں تھی اور تھوڑی دیر بعد شاید

انہوں نے خود کو بہتر محسوس کیا حالانکہ میں نے رات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ خود ہی بولے۔

''پچھلی رات بھی عجیب رہی حالانکہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں بلیک ڈاگ کی تین بوتلوں میں بھی آؤٹ نہیں ہوسکتا۔ لیکن تمہارے ہاتھ سے پیتے ہوئے چند پیگ مجھ سے میری ساری قوتیں چھین لے گئے۔''

''ہاں۔ آپ تھوڑی سی پینے کے بعد ہی حواس کھو بیٹھے تھے۔''

''مجھے سخت حیرت ہے، حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیا تم جاگتی رہی تھیں؟''

''تھوڑی دیر۔ پھر مجھے نیند آ گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''میری رائے ہے کہ تم آج ہوٹل واپس نہ جاؤ۔ میری مہمان رہو۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نہیں مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے مسٹر جم، لیکن براہِ کرم میری صاف گوئی کا بُرا نہ مانیں۔ یہ رات بھی آپ کے ساتھ ہی گنی جائے گی۔''

''ہاں۔ ہاں۔ یقیناً۔ میں پوری ادائیگی کروں گا۔'' مسٹر جم نے جواب دیا اور مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، نئے شکار نئے گاہک کی تلاش میں وقت ہی ضائع کرنا ہوتا۔ مسٹر جم اگر مجھے ایک ہفتہ بھی رکھنا چاہیں تو بس روزانہ کی ادائیگی کرتے رہیں، میرے ہاتھ سے شراب پیتے رہیں اور اپنی کھوئی ہوئی قوت کی تلاش میں سرگرداں رہیں بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

لیکن چوتھے ہی دن مسٹر جم کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ حسبِ معمول وہ ہر رات ناکامی سے دوچار ہوتے اور شرمندہ ہو کر منہ چھپا کر پڑ جاتے اب تو ان کے پاس کہنے کے لیے یہ الفاظ بھی نہ رہے تھے کہ شراب ان کے اعصاب پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہو رہی ہے۔ چنانچہ چوتھے دن انہوں نے خود ہی مجھ سے کہا کہ وہ کچھ دن کے لیے لندن سے باہر جا رہے ہیں۔ کمپنی نے ایک کام ان کے سپرد کر دیا ہے اور میں اگر چاہوں تو اپنے ہوٹل واپس جاسکتی ہوں۔

اور بھلا یہ بات ماننے میں مجھے کیا عار تھی۔ تقریباً بائیس ہزار پونڈ میری

ملکیت تھے۔ میں واپس اپنے ہوٹل چلی آئی۔ اتنی رقم کافی تھی، لندن میں رہ کر میں بڑے سکون سے کافی وقت گزار سکتی تھی، بے پناہ دولت جمع کرنے کا مجھے فی الوقت کوئی شوق نہیں تھا۔ بھاری رقم جو میں نے اپنی چالاکی سے خود کو بچاتے ہوئے کمائی تھی میری ہر طرح سے معاون تھی۔ چنانچہ ابتدائی چند روز میں نے لندن کی سیر کی اور پھر مختلف ذرائع سے مختلف ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس روز بے شمار لوگوں نے میرے قریب آنے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی کی طرف رُخ نہیں کیا۔ میں ان دو افراد کے بارے میں سوچتی تھی جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا تھا حالانکہ میں ایسی مرد بیزار بھی نہ تھی۔ میں نے اکثر رات کی تنہائیوں میں اپنے بدن کی طلب کو محسوس کیا تھا۔ لندن جیسے کھلے ہوئے شہر کی رنگینیاں میرے ذہن کے پردوں پر ہتھوڑے برساتی تھیں۔ لیکن پھر مرد کی قربت، افتخاری کے لرزتے ہوئے ہاتھ میرے سامنے لے آتی اور مجھے گھن آنے لگتی۔ میں کوئی نیا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ نجانے کیوں مجھے مرد کے تصور سے وحشت ہونے لگتی تھی۔

پھر میں لندن سے چل پڑی۔ دوسری قیام گاہ میں نے استنبول مقرر کی تھی۔ جس کے بارے میں، میں نے کافی معلومات حاصل کر لی تھیں، خود میں نے یہاں اپنے آپ کو استنبول کا باشندہ بتایا تھا۔

استنبول تک کا سفر نہایت پُرسکون تھا، میرے اندر بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ استنبول کے خوبصورت سے علاقے کے ایک خوبصورت ہوٹل میں، میں نے قیام کیا اور یہاں میرا پہلا شکار ہارون بے تھا۔ اپنی فطرت کے مطابق اور کاروباری تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے ادھیڑ عمر اور یک چشم ہارون بے کا انتخاب کیا تھا۔ جو عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا تھا اور اس کی کیفیت بھی مسٹر جم سے مختلف نہ ہوئی۔ یہاں بھی میں نے اچھی خاصی رقم کمالی تھی لیکن بدبختی سے میری ملاقات احتشام پاشا سے ہو گئی۔ بے پناہ کشش رکھنے والا انتہائی حسین جسم کا مالک۔ یہ نوجوان میرے حواس پر اس بُری طرح چھا گیا کہ ساری چوکڑی بھول گئی۔

خاصا تعلیم یافتہ تھا، بڑی سنجیدہ گفتگو کرتا تھا، شوخ اور کھلنڈرا بھی تھا، استنبول کی
مشہور جگہ شہزادوں کے جزیرے پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی
میں نے ترک سلطانوں کا محل دیکھا۔ ٹوپ کاپی کا مشہور عجائب گھر بھی دیکھا اور ہر وہ
جگہ دیکھی جو استنبول کی شہرت کا باعث تھی۔ باسفورس کی لہروں پر جزیرے مرمرا گیلی
پول اور پھر وہاں سے پرنس آئی لینڈز۔ ہر جگہ گھومے اور پھر ایک ہفتے کے بعد ان حدود
تک پہنچ گئے جہاں سے جسمانی سفر شروع ہوتا ہے۔ نہایت رومانٹک ماحول تھا۔
احتشام پاشا بے حد موڈ میں تھا جب میں نے اس کے چوڑے سینے سے چپک کر اس کی
کھردری ٹھوڑی اور اس کے بعد اس کے موٹے نچلے ہونٹ کو چوما تو احتشام پاشا کا چہرہ
سرخ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک پُر جذبات نوجوان کی مانند اس کے بازو میری بغلوں
سے نکل کر میری کمر پر چست ہو جائیں گے اور پھر وہ اتنے زور سے بھینچ کر میرے
بوسے لے گا کہ میرے بدن کی ہڈیاں کڑکڑائیں گی۔

لیکن اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے احتشام پاشا کے بدن میں
کپکپاہٹ محسوس کی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرات پائے اور میرا کلیجہ حلق میں آ گیا۔

''احتشام!'' میں نے غرائی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔

''مس۔ مس دلازیہ'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''موت کیوں آ رہی ہے تمہیں؟'' میرے ذہن میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

''اوہ۔ نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ ایسے ہنسا جیسے کسی سوکھی ہوئی
کھوپڑی پر پتھر سے ضرب لگائی جائے۔ میں نے خود پر جبر کر کے اسے مسہری پر بٹھا دیا
اور خود اس کے اوپر لد گئی۔

''دراصل۔ دراصل میں لڑکیوں کی دنیا سے ذرا دور رہا ہوں۔'' وہ پھر اسی انداز
میں ہنستا ہوا بولا۔

''اب بھی دور رہنا چاہتے ہو؟'' میں نے بھنبھوڑتے ہوئے اسے کہا۔

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ بس میں۔'' اس نے کہا اور اس کی یہ سرد مہری
میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مجھے اس کی شکل اس سیاہ بوڑھے سانپ کی مانند

معلوم ہوئی جس کی صورت تو بے حد بھیانک ہوتی ہے لیکن اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹی ہوئی
ہوتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے پھن بھی نہیں اُٹھا سکتا۔

میرے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے اور مجھے احساس بھی نہ ہو سکا کہ
کب میری پتلی اور سفید انگلیاں احتشام پاشا کی مضبوط گردن میں پیوست ہو گئیں۔
مجھے نہیں معلوم کہ احتشام پاشا نے میرے ہاتھوں کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش
کی یا نہیں۔ میں تو اس وقت ہوش میں آئی تھی جب احتشام پاشا کا آدھا بدن مسہری
سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں باہر نکل آئی تھیں اور سرخ زبان ہونٹوں سے دو انچ باہر نکلی
ہوئی تھی۔ نجانے کون سی قوت نے اس مضبوط شخص کو ہلاک کر دیا تھا۔

لیکن اس کی موت سے مجھے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی تھی۔ وہ جو زمین کا بوجھ
ہوتے ہیں کیوں زمین کا بوجھ بنے رہیں لیکن اب یہاں میری گنجائش نہیں ہے۔ میں
اب یہاں نہیں رہ سکتی چنانچہ اسی رات میں نے اپنی رہائشگاہ چھوڑ دی، حلیے میں اتنی
معمولی سی تبدیلی کی کہ پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویر کام آ سکے اور پھر موقع ملتے ہی وہاں
سے بھاگ نکلی۔

استنبول کے بعد سویڈن، چند دن ناروے، وہاں سے پھر ہانگ کانگ میری
منزلیں تھیں۔ اب میں اپنے کام پر اتنی پختہ کار ہو چکی تھی کہ میرا کوئی ثانی نہ تھا۔
بوڑھے اور مالدار لوگ جنہوں نے زندگی بھر اپنی مردانہ قوت کے جھنڈے گاڑے
ہوں گے، میرے شکار ہوتے تھے لیکن میرا وصل ان کی ذہنی موت ثابت ہوتا اور اب تو
میں نے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ اسٹاک ہوم میں کرنل شیڈو اس وقت اپنی
ساری قوتیں کھو بیٹھا تھا جب اپنی خوبصورت کوٹھی کے حسین بیڈ روم میں وہ میرے
قریب جذبات سے پُر لیٹا ہوا تھا لیکن برابر والے کمرے میں ہونے والا دھماکہ اتنا
شدید تھا کہ کرنل کے اعصاب جواب دے گئے، پھر کہاں کی شراب اور کہاں کی عورت
یا پھر ڈنمارک میں اس وقت جب ایک بہت بڑا صنعتکار میرے بدن کی بھاری قیمت
ادا کرنے کے بعد میرے قرب کی خواہش سے سُلگتا ہوا میرے نزدیک پہنچا اور سیاہ
رنگ کا ایک چھوٹا سا سانپ جو میں نے ایک سپیرے سے خرید کر اپنے پرس میں محفوظ

کر لیا تھا، پرس سے آزاد ہو کر اس کی طرف لپکا۔ کہاں کے جذبات اور کہاں کی محبت، حسن پرستی۔ وہ صنعت کار تو اس قدر خوفزدہ ہوا کہ مجھے یقین ہے کہ جس وقت بھی وہ کسی عورت کے نزدیک جاتا ہوگا اسے سانپ نظر آنے لگتے ہوں گے۔ یہ میرا طریقہ کار تھا۔ یعنی میں مالدار گاہکوں کو پھانس کر کوئی ایسی چال چلتی کہ عین وقت پر ان کے اعصاب مفلوج ہو جائیں اور پھر مفلوج اعصاب والا انسان اپنی دی ہوئی قیمت وصول نہ کر سکے تو اس میں میرا کیا قصور۔ ظاہر ہے دیا ہوا معاوضہ وہ واپس نہ مانگ سکتے تھے بلکہ کچھ بول ہی نہ سکتے تھے۔ وہ مرد عورت کے سامنے کیا بولے گا جو اس کے جوان جذبات کی پذیرائی نہ کر سکے۔ جبکہ عورت اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہو۔

میں یہ سب کچھ کر لیتی تھی۔ آج تک کوئی مرد میرے بدن کی سرحدوں کو عبور نہیں کر سکا تھا لیکن میرے ذہن میں بعض اوقات ایسی کھولن ایسی جلن ہوتی تھی جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی، اس وقت میں اپنا ذہن ٹٹولتی۔ آخر میں کیا چاہتی ہوں۔ کوئی بھی حسین ترین نوجوان میرے ایک اشارے پر میرے قدموں میں بچھنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا لیکن میں جب ان کا قرب حاصل کرتی تو میرے ذہن میں وحشتیں اُبھر آتیں اور انہی وحشتوں کا نتیجہ چھ آدمیوں کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا۔

ہارون سمیت اب تک میں چھ نوجوانوں کو قتل کر چکی تھی۔ میں اپنی اس وحشت سے خود بھی خوفزدہ تھی۔ جس وقت میری جلن عروج کو پہنچتی تو میں دیوانگی کی حدود میں پہنچ جاتی۔ دل چاہتا ساری دنیا کو فنا کر دوں یا خود کسی بہت اونچی سی عمارت سے کود کر خودکشی کر لوں۔

ہانگ کانگ کا گرین چینل ونگ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میرے پاس کافی دولت تھی۔ یہاں میں نے ایک خوبصورت [illegible] خرید لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہاں طویل قیام کروں گی بلکہ اگر ممکن [illegible] جگہ کو اپنا مستقل مسکن بنا لوں گی۔ اس دولت سے میں کوئی کاروبار کر سکتی تھی۔ [illegible] یہ کاروبار جس سے میری زندگی پر جمود طاری بھی

نہ ہو اور یہ گھناؤنی زندگی بھی ترک کی جا سکے۔ میں بھٹکے ہوئے ذہن کی مالک تھی، ہزاروں فریب کر چکی تھی لیکن اگر کبھی اپنی شخصیت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی تو وہ خود میرے لیے بھی پسندیدہ ہی تھی۔ میں سوچتی۔ کیا میری بھی کوئی نسل ہے۔ کیا میرے دل کے دروازے یونہی بند رہیں گے۔ اور اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سوال پر میرے ذہن میں تاریکی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

آج تک میں پولیس کی دسترس سے دور رہی تھی۔ نہ جانے کیوں پولیس آج تک میری راہ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں یا تو میری ذہانت ان سب پر بھاری تھی یا پھر تقدیر۔

لیکن گرین چینل کی اس عمارت میں پہلی بار ایک پولیس آفیسر نے مجھ سے ملاقات کی۔ مقامی نوجوان تھا۔ میں اسے دیکھ کر متحیر رہ گئی تھی۔ لیکن پھر میں نے سنبھل کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنا عہدہ بتاتے ہوئے مجھ سے میرے بارے میں سوالات کیے اور میں نے اسے نہایت غمزدہ لہجے میں بتایا کہ میں مصری نژاد ہوں۔ ایک مالدار شخص کی بیوی جس کی موت کے بعد اس کے رشتے داروں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی وہ طرح طرح سے مجھے ستاتے تھے اور ان سے تنگ آ کر میں نے کسی ایسے گوشے کے بارے میں سوچا جو ان سے اتنی دور ہو کہ کوئی مجھ تک نہ پہنچ سکے اور پھر میں اپنا تھوڑا سا اثاثہ سمیٹ کر یہاں آ گئی اور اب کسی کاروبار کا ارادہ رکھتی ہوں۔“

دورانِ گفتگو میرے گالوں پر آنسو لڑھکتے رہے تھے۔ جن سے وہ پولیس آفیسر متاثر ہو گیا۔

”میں چاہتی ہوں مجھے یہاں کی نیشنلٹی مل جائے کہ باقی عمر میں یہیں گزار لوں۔“

”میں آپ کی مدد کروں گا خاتون۔“ پولیس آفیسر نے ہمدردی سے کہا اور میں اس کے شانے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیوں آیا تھا۔

”ہمیں اسمگلروں کے ایک گروہ کی تلاش ہے۔ اس کا سربراہ یہیں کہیں مقیم

ہے۔ آپ کی شخصیت بھی مشکوک تھی۔ لیکن اب میری رپورٹ پولیس کو آپ کی طرف سے مطمئن کر دے گی۔"

"براہ کرم مجھے ایسے چکر میں نہ اُلجھائیں۔ میں تو پہلے ہی ستم زدہ ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے خاتون۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔" آفیسر نے جواب دیا۔ پھر وہ چلا گیا۔ لیکن مجھے اُلجھن میں چھوڑ گیا۔ میں نے آج تک اپنی حفاظت کے لیے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ اگر کبھی پولیس میری راہ پر لگ گئی تو...... اور پھر ضروری نہیں ہے کہ یہ پولیس آفیسر سب کچھ ہی سچ کہہ رہا ہو۔ ممکن ہے جس طرح میں نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔ اسی طرح وہ مجھے بے وقوف بنا کر چلا گیا ہو۔

اس رات میں بہت غور کرتی رہی، لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور بالآخر مجھے نیند آ گئی۔ دوسرے دن میں نے صرف ایک کام کیا۔ یعنی اسمگلروں کے بازار سے ایک رائفل خریدی اور خاصے فالتو راؤنڈ بھی۔ کوئی خاص بات ذہن میں نہیں تھی۔ بس یونہی اپنی حفاظت کا خیال آ گیا تھا۔ نجانے کیوں ان دنوں مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ پولیس میرے پیچھے ہے میرے بارے میں چھان بین ہو رہی ہے۔ کہیں پولیس میری اصلیت کا سراغ نہ لگا لے۔ اور وہ اوائل سرما کی ایک سیاہ رات تھی۔ موسم بڑا عجیب ہو رہا تھا۔ میں کھڑکی میں اُداس بیٹھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہی پرانے خیالات۔ کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ جس کھڑکی کے سامنے میں بیٹھی ہوئی تھی وہ کوٹھی کے سامنے کے رُخ پر کھلتی تھی۔ دفعتاً میں نے دُور سے روشنیاں چمکتے دیکھیں۔ اس کے ساتھ ہی سائرن کی آواز سنائی دی۔ اندازہ ہو گیا کہ پولیس کی کار ہے لیکن اس کا رُخ۔ اس کا رُخ اوہ کچھ ہو گیا۔ کچھ ہو گیا ورنہ۔ اس سیاہ رات میں پولیس کی کار اس طرف کیوں آ رہی ہے۔ کار برق رفتاری سے میری کوٹھی کے سامنے آ رکی اور پھر دو فائر ہوئے۔ دونوں گولیاں اس کھڑکی سے ٹکرائی تھیں جس کے نزدیک میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اب کچھ سوچنا فضول تھا۔ وہ ہو گیا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ پولیس کو میرے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ گویا زندگی کا اہم موڑ آ گیا تھا۔ شاید موت کا موڑ لیکن اس موڑ پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں مڑ جانا چاہیے۔ پولیس سے مقابلہ کیا جائے گا اور دوسرے لمحے میں اندر کی طرف جھپٹی اور رائفل اُٹھا لائی۔ اور پھر میں نے اندھادھند فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس والے کار سے اُتر کر پوزیشن لینے لگ گئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پولیس والے تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ وہ وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔ اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب کیا کروں۔ اب...... اب۔

میں رائفل لے کر اندر چلی گئی اور پھر میں نے فوری طور پر ایک ترکیب سوچی۔ رائفل میں نے ایک گٹر میں ڈال دی اور خود خوفزدہ سی ہو کر اپنی خوابگاہ میں آ گھسی۔ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ چند ہی منٹ کے بعد ہی خوابگاہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر دو پولیس آفیسر اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جو پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔

"آپ۔ آپ خیریت سے ہیں؟" وہ جلدی سے میرے قریب پہنچ گیا۔

"آہ۔ آہ...... نکل گیا۔ وہ نکل گیا۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"کس طرف گیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"اس کھڑکی سے باہر کود گیا۔" میں نے اشارہ کیا اور دونوں مجھے چھوڑ کر اس کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آ گیا۔

"آپ خوفزدہ نہ ہوں خاتون۔ وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ہم بندرگاہ سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ موٹر سائیکل لے کر بھاگا تھا لیکن یہاں اس کی موٹر سائیکل کا پٹرول ختم ہو گیا، لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ مسلح بھی ہے۔"

میرا ذہن چکرا رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا وہ دونوں سنجیدہ تھے یا میرا مذاق اُڑا رہے تھے۔ پھر جب وہ مجھے تسلیاں دے کر چلے گئے تو میں احمقوں کی طرح بیٹھی سوچتی رہی۔ کیا قصہ تھا۔ کیا قصہ تھا۔

تب عقب سے ایک آواز اُبھری۔ ''میں تمہارا شکرگزار ہوں خاتون! تم نے پولیس والوں کو خوب بے وقوف بنایا۔ اور میں چونک کر پلٹی۔ طویل القامت سرخ وسفید آدمی تھا۔ لمبی لمبی مونچھیں، موٹے موٹے مسکراتے ہونٹ۔ میں خوفزدہ ہوگئی۔

''کون ہو تم؟''

''دریچہ خان۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''لانچ پر چھاپہ مار دیا تھا سالوں نے۔ سب پکڑے گئے۔ میں نکل بھاگا۔ بس تم نے بچا لیا ورنہ۔''

''اوہ۔ تو وہ تمہارے پیچھے آئے تھے؟''

''اوئے خدائی خوار۔ تو پھر کیا......'' اس نے ایک موٹی سی گالی بکی۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔ جاؤ۔ بس ورنہ اچھا نہ ہوگا۔'' میں نے کہا اور وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

''دیکھو میم صاب۔ باہر ہمیں خطرہ ہے۔ آج رات ہم خود تمہارا مہمان رہے گا۔ گڑبڑ کرو گی تو......'' اس نے ایک لمبا سا چاقو نکال لیا اور میں قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ سفاک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بے بسی محسوس کرنے لگی۔

''چائے مل جائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نوکر سب سونے جا چکے ہیں۔'' میں نے غرا کر جواب دیا۔

''اوئے۔ تم عورت ہو کہ کتیا۔ چائے بھی نہیں بنا سکتی۔'' اس نے کہا اور پھر وہ ہنس پڑا۔ میرا بس چلتا نہیں تھا کہ اس کو دانتوں سے چبا ڈالوں۔ خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا کمینہ کہیں کا۔ کیسی حقارت سے پیش آ رہا تھا۔

''جاؤ پٹولے چائے ہی بنا دو۔''

''کیا بکواس ہے؟'' میں نے آنکھیں نکالیں اور وہ پھر ہنسنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ میرے قریب آیا اور اچانک اس نے جھک کر میرے بال پکڑ لیے اور دوسرے لمحے میں اُچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''بول چائے بنائے گی۔ بول۔'' اس نے میرے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''کتے کمینے مار ڈالوں گی۔ مار ڈالوں گی۔'' میں پلٹ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے ایک لات میری کمر پر رسید کی اور میں دروازے سے ٹکرا گئی۔ پھر مجھے اس ذلیل کے لیے چائے بنانی پڑی۔ تین چار پیالیاں چڑھا گیا۔ مجھے پوچھا بھی نہیں تھا۔ میری آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ لیکن۔ آہ! لیکن کچھ کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' اس نے بڑے میٹھے لہجے میں پوچھا۔ وہ مجھے میری خوابگاہ میں لے آیا تھا لیکن میں اسے کیا جواب دیتی۔

''بہت خوبصورت ہو!'' اس نے میرا رخسار نوچ لیا اور پھر بھوکی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''آ جا۔ ادھر آ جا۔ اکیلی رہتی ہے کیا؟'' اس نے بستر کی طرف اشارہ کیا اور میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے دھوکے سے اس پر کئی حملے کیے لیکن کمبخت بڑا ہی چالاک تھا۔ بالآخر اس نے مجھے بستر پر گھسیٹ لیا۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ لیکن زندگی میں پہلی بار میں ایک مرد کے سامنے بے بس ہوئی تھی یا مرد کے سامنے آئی تھی۔ اس نے میرے بدن پر کئی زخم لگا دیئے جن سے خون رس رہا تھا اور پھر میرا لباس میرے بدن سے جدا ہو گیا میں نے آخری جدوجہد کی۔ لیکن اس کے خوفناک بازوؤں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

اور اس کے بعد۔ اس کے بعد۔ صرف ایک رات میں۔ صرف ایک رات میں۔ میری زندگی بدل گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میری زندگی کے خشک صحرا میں بارش ہو گئی ہو۔ موسلا دھار بارش۔ میری پیاس بُجھ گئی تھی۔ ہاں زندگی میں اس خواہش کے سوا اور کیا تھا۔ ذریچہ میری ساری زندگی کا مالک بن بیٹھا۔

صبح کو میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے ناشتہ بنایا اور وہ اسی انداز میں میرا مذاق اُڑاتا رہا۔ پھر وہ چلنے کے لیے تیار ہو گیا اور میں بیقرار ہو گئی۔

''کہاں جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔''

''نہیں ذر بچہ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔''

''اوئے کیوں؟''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔تم کہاں جاؤ گے؟''

''پشاور!'' اس نے جواب دیا۔

''بس میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''معاف کرو میم صاب۔ ہم پٹھان آدمی ہے خو، رات کو خراب ہو گیا تھا۔مگر اب ہمیں افسوس ہے۔''

''میں بھی مسلم ہوں ذر بچہ۔ میں ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دینا چاہتی ہوں۔ خدائے قدُوس کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں فاحشہ نہیں ہوں۔تم میری زندگی کے پہلے مرد ہو۔''

''اوئے خداقسم!'' وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔

''یہ تو بہت گڑبڑ ہوگئی دیکھو میم صاب ہم خو گاؤں کا رہنے والا ہے۔تمہیں بیوی بنا کر ادھر لے جائے گا تو تم برداشت نہیں کر سکے گا۔''

''میں تمہارے قدموں میں دنیا کی ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر وہ سچ کر دکھایا جو کہا تھا۔ ہمارے پاس لاکھوں روپیہ ہے۔ پشاور میں ایک خوبصورت علاقے میں رہتے ہیں۔ ذر بچہ نے کاروبار کر لیا ہے اور اب وہ کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ ہم لوگ جس وقت ذر بچہ کے والدین کے پاس اس کے گاؤں جاتے ہیں تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں پہاڑوں کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں بھی پٹھان عورتوں کی طرح دور سے پانی لاتی ہوں۔تندور میں روٹی پکاتی ہوں۔ بھیڑیں چراتی ہوں اور ہر وہ کام کرتی ہوں جو پٹھان لڑکیاں کرتی ہیں اور درحقیقت زندگی کا یہ موڑ مجھے بہت پسند ہے۔کتنا چیلنج ہے اس میں۔''

☆......☆......☆